حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

صدر مؤسس انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی

ترتیب وتسوید

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور

شائع کردہ:

تنظیم اسلامی

A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔54000

فون:36293939,36316638,36366638 فیکس:36313131

www.tanzeem.org

فہرست

چند تمہیدی باتیں 4

شرک فی الذات 18

☆ اللہ کے لیے اولاد کا تصور ☆ شرک فی الذات کی دوسری صورتیں

☆ اُمت محمد یہ ﷺ پر خصوصی فضل وکرم ☆ شخصیتِ محمدی ﷺ کے تحفظ کے اسباب

☆ مسئلہ نور و بشر ☆ مسلمانوں میں اوتار کا تصور

شرک فی الصفات 50

☆ بچاؤ کا فارمولا ☆ دورِ جدید کا سب سے بڑا شرک

☆ بعض مذہبی نزاعات اوران کا حل ☆ مسئلہ علم غیب

☆ خالق اور مخلوق کے ارادہ و اختیار میں فرق و تفاوت

خدا اور انسان کی حیات کا تقابل ☆ وجود باری تعالیٰ اور نظریہ وحدت الوجود

مسئلہ شفاعت، قرآن وحدیث کی روشنی میں

شرک فی الحقوق یا شرک فی العبادت 83

☆ عبادت کا مفہوم اور اس کے اجزاء ☆ شرک فی الاطاعت

☆ شرک فی الاطاعت کی اجتماعی صورتیں ☆ شرک فی المحبت

شرک فی المحبت کی اجتماعی صورت

چند ضروری وضاحتیں 103

☆ کیا تقلید شرک ہے؟ ☆ محبت اور پرستش میں فرق

☆ ''مراسم عبودیت'' صرف اللہ کے لیے ہیں

☆ نذر لغیر اللہ شرک ہے ☆ دعا غیر اللہ کے لیے نہیں ہے

عبادت کی قبولیت کی شرط لازم۔اخلاص ☆ کیا اللہ کی ہر معصیت شرک ہے؟

شرکیہ اعمال کرنے والوں پر مشرک کا فتویٰ؟

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ○

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ‌ ۚ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَـرٰۤى اِثۡمًا عَظِيۡمًا ﴿۴۸﴾﴾
(النساء)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ یہ بات تو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے' اور اس (۲۷) کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا اُس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا۔''

﴿......وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۱۱۶﴾﴾ (النساء)

''......اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔''

﴿وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن)

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

چند تمہیدی باتیں

''حقیقت و اقسامِ شرک'' کے موضوع پر مفصل گفتگو کا یہ سلسلہ اغلباً چھ نشستوں پر مشتمل ہوگا۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کے ذریعے سے اُمت مسلمہ میں حقیقتِ شرک کے بارے میں صحیح فہم و شعور پیدا فرمائے اور اس ضمن میں ہم سے کوئی مفید خدمت قبول فرما لے!

ابتداءً مجھے اس موضوع سے متعلق کچھ تمہیدی باتیں گوش گزار کرنی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے دین کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں تعبیر کرنے کی کوشش کی جائے' یا بالفاظِ دیگر اس کی تعلیم کے لبِّ لباب اور خلاصے کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ لفظ ''توحید'' ہے۔ ہمارا دین دراصل ''دینِ توحید'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے توحید کو ہی وہ اصل امانت قرار دیا ہے جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے: ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا!

اور جوابِ شکوہ میں بھی نبی اکرم ﷺ کے مشن کو علامہ اقبال نے اسی ایک لفظ ''توحید'' سے تعبیر کیا ہے: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

تو ہمارا دین اصل میں دینِ توحید ہے۔ ''توحید'' کی ضد ہے ''شرک''۔ شرک چاہے ثنویت کی شکل میں ہو' تثلیث کی شکل میں ہو یا کثرتِ آلِـهَه کی صورت میں ہو' اِن سب صورتوں کو ہم ایک ہی لفظ ''شرک'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب یہ بات طے ہے کہ ہمارا دین' دینِ توحید ہے تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس دین میں سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑا گناہ' جو ناقابلِ درگزر ہے' وہ شرک ہے۔ چنانچہ یہی بات سورۃ النساء میں دو مرتبہ

بعینہٖ انہی الفاظ میں وارد ہوئی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''یقیناً اللہ تعالیٰ یہ بات تو ہرگز معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ اس سے کمتر گناہ جس کو چاہے گا بخش دے گا''۔ اگرچہ اس آیت کو دوسرے گناہوں کے ضمن میں کوئی کھلا لائسنس نہیں سمجھ لینا چاہیے' اللہ تعالیٰ کا کوئی پختہ وعدہ اور یقین دہانی نہیں ہے کہ وہ دوسرے گناہ لازماً بخش دے گا' بلکہ الفاظ ہیں: ''لِمَنْ يَّشَآءُ'' کہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ لہٰذا یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہمیں کھلی چھٹی مل گئی ہے کہ ہم شرک کے سوا جس گناہ میں چاہیں ملوث ہو جائیں' کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ تاہم اُمید ضرور دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شرک کی معافی کی تو کوئی صورت نہیں ہے' البتہ اُس سے کمتر گناہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا معاف فرما دے گا۔

بہرحال معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں سب سے بڑا گناہ' سب سے بڑا جرم' جو ناقابل درگزر ہے' وہ شرک ہے۔ اس حقیقت کو یوں سمجھئے کہ از روئے قرآن سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ ''ظلم'' آتا ہے' اگر سیاق وسباق سے اس کے کوئی اور معنی معین نہ ہو رہے ہوں تو وہاں اس کا معنی ''شرک'' ہے اور اسی اعتبار سے ''ظالمین'' کا معنی ''مشرکین'' ہے۔ چنانچہ آیت زیر گفتگو میں یہ حقیقت بیان ہوئی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ ''واقعہ یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

عربی زبان میں ظلم کا مطلب ہے: وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ ''کسی چیز کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھنا''۔ عدل اور انصاف یہ ہے کہ ہر چیز کو اُس کے اصل مقام پر رکھا جائے' جبکہ ظلم یہ ہے کہ کسی شے کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیا جائے۔ اب شرک میں بھی اِن دو میں سے ایک صورت ہوتی ہے کہ یا تو مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ کے برابر بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کی ایک صورت ہے۔ اور یا پھر اللہ کو (نعوذ باللہ) گرا کر مخلوقات کی صف میں لایا جاتا ہے اور یہ ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کی دوسری صورت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ''ظلم'' کا سب سے بڑا مصداق ''شرک'' ہے۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سورۃ الانعام کی آیت ۸۳ کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ سے ''ظلم'' کے بارے میں استفسار کیا تو آپ ﷺ نے سورۂ لقمان کی زیر بحث آیت ۱۳ کا حوالہ دے کر فرمایا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ اے مشرکو!) اگر تم جانتے ہو تو ذرا بتاؤ کہ دونوں گروہوں (موحّدین اور مشرکین) میں سے کون امن وسکون اور اطمینان کا زیادہ حق دار ہے؟'' ایک گروہ مشرکین کا تھا اور ایک موحّدین کا۔ ایک طرف صرف ایک اللہ کے ماننے والے تھے اور دوسری طرف وہ تھے جو اللہ کے ساتھ دوسرے بہت سے معبودوں کو ماننے والے تھے۔ لہٰذا پوچھا گیا کہ ان میں سے حقیقی ذہنی سکون اور حقیقی قلبی اطمینان کا زیادہ مستحق کون ہے؟ یہ سوال کرنے کے بعد قرآن مجید اپنے ایک عام اسلوب کے مطابق خود جواب دیتا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''جو لوگ ایمان لائیں اور اپنے ایمان کو کسی ظلم سے ملوث نہ کریں' حقیقت میں امن وسکون (اور اطمینان) کے مستحق وہی ہیں اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔''

یعنی جو اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہونے دیں۔ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں تشویش پیدا ہوئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے مشروط ہیں کہ ایمان کے ساتھ ظلم کی قطعاً آمیزش نہ ہو' تو ایسا کون شخص ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں دوسروں پر یا اپنے اوپر ظلم نہ کرتا ہو۔ غور کیجیے کہ اگر آپ نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع کیا تو یہ بھی اپنے اوپر ظلم ہے۔ تو ظلم سے بالکل بری اور بالکل پاک ہو جانا کسی فردِ بشر کے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنی اس تشویش کو ظاہر کیا کہ حضور ﷺ! ایسا شخص کون ہوگا جو ظلم سے بالکل بری ہو۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے تسلی دی کہ اس آیۂ مبارکہ میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ اور آپ ﷺ نے سورۂ لقمان کی اسی آیت کا حوالہ دیا کہ کیا تم نے یہ

آیت نہیں پڑھی:

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾﴾

تو مطلب یہ ہوا کہ جولوگ ایمان لائیں اِس شان کے ساتھ کہ شرک کی کوئی آمیزش نہ رہے تو وہ ہیں کہ جو امن کے مستحق ہوں گے اور وہی ہیں کہ جو ہدایت پر ہیں اور اپنی آخری منزلِ مراد تک پہنچ سکیں گے۔

اب میں اسی کا عکس (converse) آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ جب ہمارا دین' دینِ توحید ہے تو اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہوا کہ سب سے بڑا اور نا قابل معافی جرم اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ آپؑ کی جلالتِ قدر اور مقام و مرتبہ کا یہ عالم ہے کہ آپؑ کی تین تین نسبتیں ہیں اور تینوں ہی نہایت بلند ہیں۔ ایک نسبت اللہ کے ساتھ یہ ہے کہ آپ ''خلیل اللہ'' ہیں۔ اس خُلّتِ الٰہی کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کی عظمت کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرا خلیل صرف اللہ ہے۔ یعنی کوئی فردِ نوعِ بشر حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خُلّتِ محمدی ﷺ کے مقام پر فائز نہیں ہیں۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا)) (۱) ''اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا''۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ خُلّت کا رشتہ صرف اپنے ربّ کے ساتھ تھا۔ اور یہی وہ رشتہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے ربّ کے ساتھ جس کی قرآن اہتمام کے ساتھ وضاحت کر رہا ہے: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾﴾ (النساء) ''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنالیا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری نسبت رسولوں اور نبیوں کے ساتھ ہے' اور وہ یہ کہ آپؑ ''ابوالانبیاء'' ہیں۔ سینکڑوں جلیل القدر پیغمبر آپؑ کی نسل میں گزرے ہیں۔ اُولُوا الْعَزْمِ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب الخوخة والممر فی المسجد۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ۔

مِنَ الرُّسُل میں سے تین یعنی حضرات موسیٰ' عیسیٰ اور محمدؐ رسول اللہ علیہم الصلاۃ والسلام ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ ان میں سے عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بن باپ کے پیدا ہوئے لیکن ان کی والدہ مریم سلامٌ علیہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہی سے ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں نبی آپؑ کی نسل میں سے ہیں۔ تو آپؑ ابوالانبیاء ہیں۔

آپؑ کی تیسری نسبت پوری نوعِ انسانی کے ساتھ یہ ہے کہ آپؑ ''امامُ الناس'' ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے: ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ﴾ (البقرۃ:۱۲۴) ''اور (یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو اُن کے ربّ نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا اتر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں''۔ اس جلالتِ قدر کے ساتھ قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے تو اُن کو جو آخری سند دی جاتی ہے وہ یہ ہے: ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾﴾ (البقرۃ) ''اور آپ (ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

معلوم ہوا کہ شرک سے بالکل آزاد ہو جانا انسانیت کے لیے معراج ہے اور یہ بلند ترین مقام ہے جس تک انسان پہنچ سکتا ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ فرما دے کہ میرا یہ بندہ مشرک نہیں ہے' میرا یہ بندہ شرک سے پاک ہے تو گویا اُسے آخری سند مل گئی' آخری سرٹیفکیٹ اور آخری testimonial مل گیا۔

اب تک کی گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ ایک طرف تو ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم' سب سے بڑا گناہ' سب سے بڑا ظلم' جو نا قابل عفو ہے' وہ شرک ہے۔ اور دوسری طرف سب سے بڑی سند' سب سے بڑا سرٹیفکیٹ اور سب سے اونچا مقام یہ ہے کہ انسان شرک سے بالکل پاک ہو۔ اب ان دونوں چیزوں کو بیک وقت ذہن میں رکھتے ہوئے میں ایک نتیجہ نکال رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ واقعتاً ہر گمراہی' ضلالت اور کج روی' خواہ وہ نظریات کی ہو' عقائد کی ہو یا اعمال کی' اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں شرک سے ملتے ہیں۔ اور ہر خیر و خوبی' بھلائی' نیکی' صحتِ فکر' صحتِ عقیدہ' صحتِ عمل وغیرہ کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب توحید کی فروع (corollaries) اور لازمی نتائج ہیں۔ تو اس طرح

سے یہ ایک ہمہ گیر تصور ہے۔ شرک کی اقسام اور اس کی فروع کو اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ شجرۂ خبیثہ ہے کہ ہر بدی، ہر گناہ، ہر جرم اور ہر نظریہ یا خیال کی گمراہی لازماً اسی کی کسی نہ کسی شاخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کے برعکس ہر خیر، ہر نیکی اور ہر بھلائی، خواہ وہ خیال اور نظریے کی ہو یا عمل کی ہو، اس کا تعلق لازماً توحید ہی کے شجرۂ طیبہ سے ہے۔ اس ''شجرِ توحید'' کے لیے قرآن مجید میں تمثیل آئی ہے اور اس کے بارے میں الفاظ آئے ہیں:
﴿اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾﴾ (ابراہیم) ''اس کی جڑ مضبوط و مستحکم ہے اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔''

شرک کی ہمہ گیری کا ایک تصور قرآن مجید میں سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ میں یوں بیان ہوا ہے:

﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾

''اور انسانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں، مگر کسی نہ کسی نوع کے شرک کے ساتھ''۔

یہ بات جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا انکار تو تاریخ انسانی میں آپ کو شاذ ہی کہیں ملے گا، کہیں کہیں اس قسم کے لوگ مل جاتے ہیں کہ جن کی مت بالکل ماری گئی ہو۔ آج کے دَور میں بظاہر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ خدا کا انکار بہت عروج پر ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا کو وہ بھی مانتے ہیں جنہیں منکرین خدا سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت انہوں نے مادّے کو خدا کے مقام پر لے جا کر بٹھا دیا ہے، خدا کا انکار نہیں کیا ہے۔ ایک حقیقت کبریٰ کو ماننے پر سب مجبور ہیں، جبکہ سارا اختلاف خدا تعالیٰ کی صفات میں ہے۔ مثلاً یہ اختلاف کہ وہ الحیّ ہے یا مُردہ ہے۔ اگر مُردہ ہے تو اسے مادّہ کہہ لیجیے، اور اگر الحیّ القیّوم ہے، صاحب ارادہ ہے تو وہ اللہ ہے۔ چنانچہ فرق تو سارا صفات کا ہے۔ بہرحال یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ خدا کو خدا کے نام سے ماننے والے تاریخ انسانی میں ہمیشہ عظیم اکثریت میں رہے ہیں اور خدا کا صاف انکار کرنے والے شاذ رہے ہیں۔ خدا کو کچھ اور ناموں کے تحت ماننے والوں کی تعداد بھی شاید کچھ مل جائے، لیکن جو سب سے بڑی گمراہی ہمیشہ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بڑے خدا کو

ماننے کے ساتھ ساتھ کچھ اور چھوٹے خداؤں کو بھی مانا اور تسلیم کیا گیا، ایمان کے ساتھ کسی نوع کے شرک کی آمیزش کر لی گئی، اور یہ ہے اصل گمراہی جو ہمیں پوری تاریخ انسانی میں پھیلی ہوئی اور چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں اپنے حقیقی قلبی احساسات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ جان بوجھ کر کبھی شرک نہیں کرتا، بلکہ ایسا ناممکن ہے۔ اس کے تصورات میں اگر شرک آتا ہے تو غیر محسوس طریقے سے در آتا ہے، کسی مغالطے کے باعث آتا ہے، وہ اس کو شرک سمجھ کر شرک نہیں کرتا، اس میں جہالت اور ناسمجھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ ہر دَور میں شرک کا یہ مرض ایک نئی صورت اختیار کر کے سامنے آتا ہے جس کو پہچاننے میں کوتاہی رہ جاتی ہے، اور جب تک اس کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے اس سے پوری طرح بچنا ممکن نہیں۔ بقول شاعر:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

یعنی خواہ تم کسی بھی رنگ کا لبادہ اوڑھ کر آ جاؤ میں تمہیں تمہارے قد سے پہچان لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بزعمِ خویش بڑا موحّد ہو اور پچھلے ادوار میں شرک کی جتنی بھی صورتیں رائج رہی ہوں اور علماء نے جن جن کی نشاندہی کر دی ہو اُن سب سے وہ اپنے آپ کو بری اور پاک کر چکا ہو، بایں ہمہ اپنے دَور کے شرک کو نہ پہچان پایا ہو اور اس میں وہ ملوث ہو۔
اس پر گفتگو تو بعد میں ہو گی لیکن میں مثال کے طور پر علامہ اقبال کی نظم ''وطنیت'' پیش کر رہا ہوں:

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اب غور کیجیے کتنا پیارا مصرعہ ہے: ''تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور''۔ آج سے ساڑھے چار ہزار برس کا آزر پتھر کی مورتیاں تراشتا تھا اور آج کا آزر کچھ خیالی تصورات کے بُت بنائے ہوئے ہے۔ زمانے زمانے کی بات ہے۔ اُس وقت انسان شاید زمین سے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ فٹ چھلانگ لگا سکتا ہوگا' لیکن آج چاند تک پہنچا ہوا ہے۔ لہٰذا شرک نے بھی بڑی اونچی اڑان اڑی ہے اور بڑی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ اب ضرورت اُس عقابی نگاہ کی ہے جو اپنے دَور کے شرک کو پہچان لے۔ اگر یہ بصیرت نہیں ہوگی تو ہوسکتا ہے' جیسا کہ میں نے عرض کیا' ایک شخص اپنے خیال میں پورے خلوص کے ساتھ شرک کی ہر قسم سے اعلانِ براءت کر چکا ہو اور عملاً اپنے آپ کو اس سے بری کر چکا ہو' لیکن اس کے باوجود وہ کسی نوع کے شرک میں مبتلا اور ملوث ہو۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بڑا جامع اور ہمہ گیر تصور ہمارے سامنے ہو۔ اور نہ صرف یہ کہ ہم اپنے ذہن اور فہم میں تمام اقسامِ شرک کا احاطہ کرلیں' بلکہ ہمارے اندر وہ اجتہادی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ شرک جو بھی نیا لبادہ اوڑھے اور جو بھی نئی شکل اختیار کرے' اسے بھی ہم پہچان سکیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک اندرونی بصیرت کی۔ اس کے لیے وہ اصول تلاش کر لیے جائیں کہ جنہیں اگر مدّنظر رکھا جائے تو شرک چاہے جس صورت اور شکل میں بھی آ رہا ہو' جو بھی نیا بھیس بدلے اور جو بھی نیا لبادہ اوڑھے اس میں انسان اس کو پہچان لے۔ لہٰذا اِس وقت جو بحث ہوگی وہ زیادہ تر اقسامِ شرک کے ذیل میں ہوگی۔

اقسامِ شرک کے سلسلے میں ہمارے ہاں علماء نے مختلف تقسیمیں کی ہیں۔ مثلاً ایک تقسیم یہ ہے کہ ایک شرکِ جلی ہے اور ایک شرکِ خفی ہے۔ یعنی ایک تو نمایاں اور کھلم کھلا شرک ہے۔ مثلاً ایک شخص بُت کو سجدہ کر رہا ہے' جبکہ ایک خفی شرک ہے کہ جس کا تجزیہ کر کے ہی پتا چلتا ہے کہ شرک ہوگیا' وہ بظاہر نظر نہیں آتا۔ اس کی مثال یہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ ((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (۱) ''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اُس نے شرک کیا۔'' ایک

(۱) مسند احمد' کتاب الشامیین۔

شخص نماز پڑھ رہا ہے' لیکن جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے تو وہ اپنی نماز لمبی کر دیتا ہے' سجدہ طویل کر دیتا ہے' تو حضور ﷺ کے فرمان کی رو سے یہ شرک ہے۔ بظاہر تو وہ وہی نماز پڑھ رہا ہے' اس میں وہی قیام ہے' وہی رکوع ہے' وہی سجود ہے' اُس نے وہی سورۃ الفاتحہ پڑھی ہے' وہی ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' اور وہی ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' کہا ہے۔ اپنی طرف سے اُس نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے' سوائے اس کے کہ ذرا نماز کا دورانیہ بڑھ گیا ہے' اگر پہلے دس سیکنڈ کا سجدہ ہو رہا تھا تو اب پندرہ سیکنڈ کا ہوگیا' لیکن تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سجدے کے دو مسجود ہو گئے۔ دس سیکنڈ کا سجدہ تو اللہ کے لیے تھا' لیکن بقیہ پانچ سیکنڈ کا سجدہ اُس شخص کے لیے ہے جسے وہ دکھا رہا ہے' اور یہی شرک ہے۔ تو ایک ہے شرکِ جلی اور ایک ہے شرکِ خفی۔

ایک اور تقسیم اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ ایک ہے عقیدے کا شرک اور ایک ہے عمل کا شرک۔ ایک شخص مختلف معبودوں کو مانتا ہے نام لے کر' جبکہ ایک شخص وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی معبود کو نام لے کر تو نہیں مان رہا' لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عمل میں شرک ہے۔ مثلاً نفس پرستی ایک قسم کا شرک ہے۔ ایک طرف حکم ہے اللہ کا اور ایک طرف خواہش ہے اپنے نفس کی۔ ہم کتنے ہی مواقع پر اللہ کے حکم کو پسِ پشت ڈال کر اپنے نفس کی خواہش کو مقدم کرتے ہیں! اُس وقت ہمارا اصل معبود کون ہے؟ ہمارا نفس ہی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ۝۴۳﴾

(الفرقان)

''(اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے غور کیا اُس شخص کے حال پر جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟ تو کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری لیں گے؟''

یہاں نوٹ کیجیے کہ لفظ ''اِلٰـہ'' استعمال ہوا ہے' تاکہ کوئی مغالطہ نہ رہے۔ اور یہی ہمارے کلمۂ طیبہ کا لفظ ہے: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ تو معلوم ہوا کہ عمل میں شرک ہو رہا ہے' اگرچہ عقیدے میں شرک نہیں ہے۔ اُس شخص نے کبھی بھی اپنے نفس کو معبود مانا نہیں' بلکہ آپ اس

سے یہ بات کریں گے تو وہ آپ کا سر پھوڑ دے گا‘ لیکن درحقیقت اس کے عمل میں شرک موجود ہے۔ اسی کے ذیل میں نبی اکرمﷺ کی ایک حدیث ہے جس میں آپﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) (۱) ’’ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ‘‘۔ یہاں لفظ ’’عبد‘‘ لایا گیا ہے۔ اسی سے ’’عبادت‘‘ بنا ہے جس کے لیے فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ......﴾ (البقرۃ:۲۱) ’’اے لوگو! عبادت کرو اپنے ربّ کی جس نے پیدا کیا تمہیں......‘‘ آپ کو معلوم ہے کہ روپے اور پیسے کی پوجا کس انداز سے ہوتی ہے۔ روپے کو کبھی کسی نے معبود نہیں مانا‘ لیکن اگر کوئی بالفعل اس کی بندگی کر رہا ہے تو اس کا نام خواہ عبدالرحمٰن ہو یا عبداللہ ہو‘ لیکن اصل میں وہ ’’عبدالدّینار‘‘ اور ’’عبدالدّرہم‘‘ ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ ہم میں سے کتنے ہوں گے جو اِن دونوں چیزوں یعنی نفس پرستی اور دولت پرستی کے اندر ملوث نہ ہوں! اگر کوئی ستر فیصد اللہ کے احکام مان رہا ہے تو تیس فیصد میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اور آپ اس کوتاہی کو صرف ایک منفی قدر نہ سمجھئے کہ بس اللہ کی بندگی میں کمی اور کوتاہی ہے۔ نہیں! بلکہ وہاں مثبت طور پر آپ کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں۔ یہ نفس کی بندگی ہو رہی ہے‘ پیسے کی بندگی ہو رہی ہے‘ شہرت کی پوجا ہو رہی ہے‘ اقتدار کی پوجا ہو رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہماری زندگیوں میں یہ دونوں عبادتیں‘ دونوں پرستشیں‘ دونوں پوجائیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسے لوگوں پر یہ آیۂ مبارکہ صادق آتی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۸۵﴾ (البقرۃ)

’’تو کیا تم کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ تو تم میں سے جو کوئی یہ جرم کریں اُن کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار کر دیا جائے اور آخرت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجهاد والسیر‘ باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله۔

جھونک دیا جائے؟ اور اللہ اُن حرکات سے غافل نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔‘‘

اب یہاں ’’اَشَدِّ الْعَذَابِ‘‘ کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ طرزِ عمل شرک ہے‘ اور شرک وہ جرم ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اس کی بخشش کا کوئی سوال نہیں۔

اقسامِ شرک کے حوالے سے دو تقسیمیں تو وہ ہیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھیں‘ یعنی شرکِ جلی اور شرکِ خفی‘ یا شرکِ عقیدہ اور شرکِ عملی۔ امام ابن تیمیہؒ کا ان مباحث میں بڑا اونچا مقام ہے۔ اُن کی اصطلاحات کے مطابق ایک ہے شرک فی المعرفۃ‘ یعنی اللہ کی پہچان میں شرک‘ اور ایک ہے شرک فی الطلب۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۷۳﴾ (الحج) ’’مدد چاہنے والا بھی کمزور اور بودا ہے اور جس سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور اور بودا ہے‘‘۔ ہر انسان کی زندگی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مقصود اور مطلوب کو معین کر کے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ اور توحید کا تقاضا یہ ہے کہ مقصود اور مطلوب کے درجے میں سوائے اللہ کے اور کوئی نہ ہو۔ کلمۂ طیبہ ’’لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ‘‘ کا اس اعتبار سے مفہوم ہے: لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ‘ لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ‘ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ اگر مقصود و مطلوب اور محبوب ہونے کے اعتبار سے کوئی اور اللہ کے برابر ہو گیا تو یہی تو شرک ہے۔ بقولِ اقبالؒ:

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

امام ابن تیمیہؒ نے شرک کی بحث کو اِن دو اصطلاحات میں جمع کیا ہے۔ ’’شرک فی المعرفۃ‘‘ یہ ہے کہ اللہ کی پہچان میں کوئی کمی ہو‘ اس کی ذات و صفات کے ضمن میں کسی کو لا کر اس کا ساجھی اور ہم پلہ بنا دیا گیا ہو۔ یہ معرفت خداوندی میں شرک ہے۔ اور جو شرک فی العمل ہے اس کو انہوں نے نام دیا ’’شرک فی الطلب‘‘ کا کہ اگر مقصود و مطلوب اور محبوبِ حقیقی ہونے کے اعتبار سے کوئی شے‘ کوئی شخص‘ کوئی ہستی‘ کوئی ادارہ اللہ کے ہم پلہ ہو جائے‘ دل کے سنگھاسن پر اگر وہ اللہ کے برابر آ کر بیٹھ جائے تو یہ شرک فی الطلب ہے۔

اقسامِ شرک کے حوالے سے ایک تیسری تقسیم بھی ہے جو میرے نزدیک زیادہ عام فہم (comprehensive) ہے اور میں ذیل میں اسی کے اعتبار سے بحث کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس تقسیم کے حوالے سے اقسامِ شرک کا ایک دفعہ احاطہ کر لیا جائے تو اِن شاء اللہ وہ باطنی بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ اگر کبھی شرک کی کوئی اور صورت بھی پیدا ہوئی تو اِس بصیرت کی روشنی میں اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی۔ اس تقسیم کی رو سے شرک کی تین قسمیں ہیں: ایک ہے ''شرک فی الذات''، یعنی اللہ کی ہستی، اللہ کی ذات میں کسی اور کو اس کا ساجھی اور ہم پلہ بنا لینا۔ اس کے لیے عربی کا اصل لفظ ''کُفُو'' ہے۔ (ہم اردو بول چال میں عام طور پر ''ہم کفو'' کہہ دیتے ہیں، حالانکہ لفظ ''کفو'' میں ''ہم کفو'' کا پورا مفہوم موجود ہے جو فارسی ترکیب ہے۔) سورۃ الاخلاص میں دوٹوک الفاظ میں فرما دیا گیا: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾﴾ ''اور کوئی اس کا کفو نہیں ہے''! ''کفو'' کا مطلب ہے برابر، ہم سر۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے: ''اور نہیں ہے اس کے جوڑ کا کوئی۔'' پہلے زمانے میں شادی بیاہ کے معاملے میں یہ لفظ بہت استعمال ہوتا تھا کہ شادی کفو میں ہونی چاہیے، یعنی برابری کا معاملہ ہونا چاہیے اور اس معاملے میں مختلف اعتبارات سے دیکھا جانا چاہیے، تاکہ انمل، بے جوڑ والی بات نہ ہو جائے اور عدم موافقت نہ ہو، بلکہ ماحول کچھ ایک جیسا ہی ہو جس میں لڑکا اور لڑکی پلے بڑھے ہوں، تقریباً ایک ہی سطح کی زندگی انہوں نے بسر کی ہو، عادات میں کہیں بہت زیادہ فرق نہ ہو، مبادا نباہ میں رکاوٹ بن جائے۔ اور یہ معاملہ درحقیقت حکمت میں سے ہے۔ تو اس لفظ ''کفو'' کو ذہن میں لائیے کہ کسی کو اللہ کا کفو بنا دینا ''شرک فی الذّات'' ہے اور یہ بدترین، عریاں ترین اور گھناؤنا ترین شرک ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔

دوسری قسم کا شرک ہے ''شرک فی الصفات'' کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی کو اس کے برابر کر دینا، مدّ مقابل بنا دینا، ساجھی قرار دے دینا اور مثل بنا دینا۔ آپ علماء کرام کے خطبات میں یہ الفاظ سنتے ہوں گے: لَا مِثْلَ لَهٗ وَلَا مِثَالَ لَهٗ وَلَا مَثِيْلَ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ ۔ یہ تمام الفاظ اسی اعتبار سے ہیں کہ شرک کے ہر شائبہ کی نفی ہو جائے، ہر

نوعیت کا انکار ہو جائے، کہ نہ کوئی اس کا کفو ہے، نہ کوئی اس کا مثل ہے، نہ کوئی اس کی مثال ہے، نہ کوئی اس کا ہم رتبہ ہے، نہ کوئی اس کا ہم پلہ ہے، نہ کوئی اس کا مدّ مقابل ہے، نہ کوئی اس کا ساجھی ہے۔ تو صفات میں کسی کو کسی بھی پہلو سے اللہ تعالیٰ کے برابر کر دینا شرک فی الصفات ہے۔ اور میں پیشگی طور پر یہ عرض کر دوں کہ یہ بڑا لطیف اور نازک سا معاملہ ہے اور اس میں ایک علمی مسئلہ involve ہے۔ اس میں چند ایسی لطیف باتیں ہیں کہ اگر وہ مدّ نظر نہ رہیں تو بڑی آسانی سے انسان کا قدم توحید کی شاہراہ سے ہٹ کر شرک کے کسی راستہ پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں مغالطہ بے شعوری طور پر، بلکہ میں تو کہوں گا کہ خلوص کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نوع کے شرک کے بارے میں ع ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را'' والا معاملہ ہے۔ جیسے پل صراط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے، ایسا ہی معاملہ شرک فی الصفات کا ہے۔ اس کے چند اہم اور موٹے موٹے مسائل پر جب گفتگو ہو گی تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی اور آپ کو اِن شاء اللہ، الجبرا کے فارمولوں کی طرح وہ بات ہاتھ میں آ جائے گی کہ جس کے بعد ایسے بہت سے عقدے جو ہمارے ہاں عقائد کے ضمن میں پڑے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے بڑی کھینچ تان، کشمکش اور رسہ کشی ہے، وہ تمام عقدے حل ہوتے چلے جائیں گے۔

تیسرا شرک ہے ''شرک فی الحقوق''، یعنی اللہ کے حقوق میں اس کے ساتھ شرک کرنا، کسی کو حقوق کے معاملے میں اس کا ساجھی بنانا یا اس کے برابر کرنا۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کے حقوق اگر گنے جائیں تو بہت ہو جاتے ہیں، لیکن ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق ایک لفظ ایسا بھی ہے کہ جس میں اللہ کے تمام حقوق جمع ہو جاتے ہیں اور وہ لفظ ''عبادت'' ہے، جو تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کی دعوت کا مرکزی نقطہ رہا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرۃ) ''اے لوگو! عبادت کرو اپنے ربّ کی جس نے پیدا کیا تم کو اور اُن کو جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ تم بچ سکو''۔ اور: ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ (ھود: ۵۰، ۶۱، ۸۴) ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا

تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔'' اور: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝٣﴾ (نوح) ''یہ کہ اللہ کی عبادت کرو' اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری پیروی کرو۔''

عبادت انسان کی غایتِ تخلیق ہے' اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝٥٦﴾ (الذّٰریت) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت (بندگی) کے لیے پیدا کیا۔'' لہٰذا اس لفظ ''عبادت'' میں اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق آ گئے۔ چنانچہ ''شرک فی الحقوق'' کو ''شرک فی العبادت'' کہا جا سکتا ہے۔ عبادت کے پانچ رُخ ہیں جن کے بارے میں بحث سے معلوم ہو جائے گا کہ شرک فی العبادت کی کون کون سی صورتیں ہیں۔ اس سے ہمیں اِن شاء اللہ موجودہ شرک کے علاوہ وہ قدیم شرک جو دنیا میں پائے گئے' ان سب کا فہم و شعور حاصل ہو جائے گا' بلکہ وہ بصیرت بھی پیدا ہو جائے گی کہ جس کے نتیجے میں آئندہ بھی اگر یہ مرض کسی اور صورت میں ظاہر ہوا تو اس کو سمجھنا اور پہچاننا آسان ہو جائے گا۔

شرک فی الذات

جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہ بدترین' عریاں ترین' گھناؤنا ترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین شرک ہے۔ دنیا میں اس شرک کی دو صورتیں رائج رہی ہیں۔ ایک کو مذہبی نوعیت کا شرک کہا جا سکتا ہے اور ایک کو فلسفیانہ نوعیت کا شرک۔ بلکہ صحیح تر تعبیر یہ ہوگی کہ پہلا شرک وہ ہے جو اُن قوموں میں پیدا ہوا جو اپنے آپ کو رسولوں سے منسوب کرتی ہیں اور آسمانی ہدایت پر یقین رکھتی ہیں۔ اور دوسرا شرک وہ ہے جو اُن قوموں میں پیدا ہوا کہ جن کے مذاہب کی اصل حقیقت فلسفیانہ ہے' کچھ حکماء اور فلاسفہ کے فکر اور سوچ پر اُن کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔

پہلی نوعیت کا شرک ہے کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی قرار دینا۔ ظاہر بات ہے کہ بیٹا یا بیٹی تو ہم جنس اور ہم نوع ہوئے! جیسے مغل کا بیٹا مغل ہے' انسان کا بیٹا انسان ہے اور گھوڑے کا بیٹا گھوڑا وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ یہ نوع میں' جنس میں' مرتبہ میں' غرض ہر اعتبار سے بالکل برابری اور کفو والا معاملہ ہے' اور یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے شرک پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ اور یہ کس قدر قابل تعجب بات اور ستم ظریفی ہے کہ اس نوع کے شرک میں مبتلا وہ لوگ ہوئے جو نبیوں اور رسولوں کے ماننے والے ہیں' جو جلیل القدر پیغمبروں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے ہیں' آسمانی ہدایت کا دم بھرنے والے اور اللہ کی کتابوں کو ماننے والے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو مشرکینِ عرب تھے جو اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے اس موحّدِ اعظم حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام کی طرف' اور اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم حنفی ہیں' یعنی دینِ حنیف پر ہیں' وہی دینِ حنیف جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا۔ اور ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

دوسری طرف یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' کہا' انہیں اللہ کا بیٹا مانا گیا۔ تورات کو آپ پڑھ جایئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں شرک کی مذمت اس قدر شدت کے

ساتھ آئی ہے کہ شرک کو زنا کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں بار بار آپ کو یہ تمثیل ملے گی کہ جیسے کسی شخص کی بیوی زنا کی مرتکب ہو اور اپنے شوہر سے بے وفائی کرے بالکل یہی طرزِ عمل ہے اُس شخص کا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہے اور شرک کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو اللہ کا شریک بنانے کی سزا کے طور پر ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا' اور یہی وہ ارتداد کی سزا ہے جو ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ وہاں شرک کی پاداش میں ہزاروں اسرائیلیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ لیکن اسی قوم میں پھر یہ شرک پیدا ہوا کہ انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا۔ اور یہ مرض اور گمراہی اپنی انتہا اور نقطۂ عروج کو پہنچی ہے عیسائیوں کے ہاں جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ یہودیوں میں تو صرف ایک دَور ایسا گزرا اور اُن کے کچھ مخصوص فرقے تھے جنہوں نے یہ شرک کیا' مگر مسیحیت تو کُل کی کُل اسی عقیدے پر مبنی ہے' اور انہوں نے اس معاملے میں اس درجے غلو کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو صراحت کے ساتھ اللہ کا صلبی بیٹا قرار دیا اور ان کے لیے لفظ ''وَلَد'' استعمال کیا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ''اِبْن'' کے لفظ میں دو احتمالات ہیں۔ عربی زبان میں ''ابن'' کسی تعلق اور نسبت کو بھی ظاہر کرتا ہے' اور ضروری نہیں کہ وہ باپ اور بیٹے ہی کی نسبت ہو۔ مثلاً آپ کسی کو ''ابنُ الوقت'' کہتے ہیں تو وہ وقت کا بیٹا نہیں ہے' بلکہ اس کا بندھن اور تعلق وقت سے ہے' مرغِ بادنما ہے' ہوا اِدھر کی چل رہی ہو تو اِدھر کو اُس کا رُخ ہے' اُدھر کی چل پڑے تو اُدھر کو اس کا رُخ ہو جائے گا۔ اسی طرح ''ابنُ السبیل'' کہتے ہیں راستہ چلنے والے مسافر کو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ راستے کا بیٹا ہے' بلکہ راستے کے ساتھ جڑا ہوا ہے' چلا جا رہا ہے۔ تو ''ابن'' کا لفظ ذو معنیین ہے۔ اناجیلِ اربعہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ''بیٹا'' کے معنوں میں اپنے لیے بطور استعارہ لفظ ''ابن'' استعمال کرتے تھے۔ جیسے تورات میں شرک کے لیے زنا کی تمثیل ملتی ہے کہ جس طرح ایک بیوی زنا کا ارتکاب کر کے اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی ہے' اسی طرح ایک شخص شرک کر کے اپنے ربّ سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسی طرح اس نسبت کو دیکھئے جو باپ اور بیٹے کے

درمیان ہے کہ باپ بھی چونکہ اپنے بیٹے کو پالتا پوستا اور پروان چڑھاتا ہے' اس کی پرورش کرتا ہے' لہٰذا اسی نسبت سے حضرت مسیحؑ نے اللہ کو مخلوق کا ربّ ہونے کی حیثیت سے آسمانی باپ اور انسانوں کو اُس کے بیٹے قرار دیا۔ اناجیل اربعہ میں یہ بات ملتی ہے کہ حضرت مسیحؑ اللہ تعالیٰ کو جہاں ''میرا آسمانی باپ'' کہتے ہیں وہاں ''تمہارا آسمانی باپ'' بھی کہتے ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہے کہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ (exclusively) اپنے ہی لیے لفظ ''ابن'' استعمال کیا ہو' بلکہ اللہ تعالیٰ کو ''تمام نوعِ انسانی کا آسمانی باپ'' کہا گیا اور صرف استعارہ کے طور پر۔ لیکن عیسائیوں نے آگے بڑھ کر اس عقیدے کو جہاں پہنچایا ہے وہ لفظ ''وَلَدٌ'' ہے۔ ''وَلَدٌ'' کے معنی صرف صلبی اولاد کے ہیں' اور اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں۔ لفظ ''وَلَدٌ'' میں کسی استعارے یا کسی اور تعلق کا معاملہ بھی نہیں ہے۔ تو یہ جان لیجیے کہ قرآن مجید نے عیسائیوں کے بارے میں تو دونوں باتیں کہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''ابنُ اللّٰه'' بھی قرار دیا اور ''وَلَدُ اللّٰه'' بھی قرار دیا۔ جیسے اُن کا قول نقل ہوا: ﴿اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ (البقرۃ:۱۱٦ والکہف:۴)۔ لیکن قرآن نے یہودیوں کے بارے میں صرف ایک الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ''ابنُ اللّٰہ'' قرار دیا۔ اور مشرکین عرب کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

اب آپ دیکھئے' سورۃ الاخلاص' جو توحید کے موضوع پر جامع ترین سورۃ ہے' اس میں چار آیتوں میں سے پہلی دو آیتیں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢﴾ تو فلسفیانہ ہیں اور بہت بلند مفہوم کی حامل ہیں۔ لیکن آخری دو آیات جہاں آ کر مضمون سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے' وہ اسی نوع کے شرک سے متعلق ہیں اور اس کی نفی کر رہی ہیں: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣﴾ ''نہ اُس نے جنا اور نہ وہ جنا گیا''۔ تمام صلبی رشتوں سے وہ بالکل پاک ہے۔ نہ کوئی اس کا باپ ہے نہ کوئی اس کی ماں ہے' نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کی بیٹی ہے۔ اور پھر اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا' جو نتیجہ نکالا گیا' وہ ہے: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤﴾ ''اور اس کا کفو کوئی نہیں ہے''۔ اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے' اس کی برابری کا کوئی نہیں ہے' اس کا ہم پلہ کوئی نہیں ہے' اس کا ہم جنس کوئی نہیں ہے اور اس کی نوع

کا کوئی نہیں ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت جو شرک کے موضوع پر بڑی جامع آیت ہے، جس میں شرک کی نفی کے چار اسلوب اختیار کیے گئے، اس میں سب سے پہلا اسلوب یہی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا...... ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) کہیے کہ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا......'' سورۂ بنی اسرائیل کے فوراً بعد سورۃ الکہف شروع ہوتی ہے۔ یہ دونوں سورتیں جڑواں ہیں اور حکمت قرآنی کے دو بہت بڑے خزانے ہیں جو قرآن مجید کے بالکل وسط میں موجود ہیں۔ سورۃ الکہف کے پہلے رکوع میں ذکر ہو رہا ہے:

﴿وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ④ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ⑤﴾

''اور (اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ پر یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ) وہ تنبیہہ کر دیں اُن کو جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا۔ ان کے پاس اس ضمن میں کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے آباء کے پاس۔ بہت بڑی بات ہے جو اُن کے مُنہ سے نکلتی ہے اور وہ محض جھوٹ بکتے ہیں''۔

اس نوع کے شرک پر اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا یہ انداز اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے اگلی سورۃ، سورۂ مریم کے آخری رکوع میں۔ جو شخص عبارت کے تیور کو پہچانتا اور لہجے کے فرق کو جانتا ہو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں اللہ کا غیظ و غضب کس طرح بھڑکتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ٨٨ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ٨٩ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ٩٠ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ٩١ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ٩٢﴾

''انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے۔ تم ایک بڑی بھاری بات کر رہے ہو (بڑی جسارت اور بڑی ڈھٹائی کا معاملہ کر رہے ہو۔ یہ اس درجے کی جسارت اور

ڈھٹائی ہے کہ) آسمان اس وجہ سے پھٹ پڑنے کو ہیں، زمین شق ہونے کو ہے اور پہاڑ ایک دھماکے کے ساتھ گر پڑنے کو ہیں، اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے بیٹا قرار دیا، حالانکہ رحمٰن کے تو یہ شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔''

ان میں سے آخری آیت بہت قابل غور ہے۔ شایانِ شان نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہ بڑی سادہ سی بات ہے، لیکن پیش پا افتادہ حقائق بسا اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اولاد کی ضرورت اصل میں اس لیے ہوتی ہے کہ کوئی ہستی خود فانی ہو۔ اگر کسی کو بقاء اور دوام حاصل ہو اور اسے دنیا میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہو تو اسے کسی اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اولاد تو بقاءِ نوع اور بقاءِ نسل کے لیے ہے۔ جو فانی ہے وہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ میری اولاد کی شکل میں میری ہستی کا ایک تسلسل برقرار رہے گا۔ اسی لیے تو وہ روتے ہیں جن کے ہاں اولاد نہیں، خاص طور پر جن کی اولادِ نرینہ نہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا نام مٹ جائے گا۔ یہی طعنہ تو دیا گیا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کو کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں، ان کا نام ختم ہو جائے گا، یہ تو ابتر ہیں، جس کے جواب میں سورۃ الکوثر نازل ہوئی:

﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③﴾

''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا کی ہے۔ پس اپنے ربّ کی نماز پڑھیے اور (اُسی کے نام کی) قربانی کیجیے۔ یقیناً آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہوگا۔''

جبکہ اللہ تعالیٰ تو خود دائم ہے، قائم ہے، باقی ہے، الحیّ القیّوم ہے، لہٰذا ظاہر بات ہے کہ یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے بھی کسی اولاد کی احتیاج ہو۔ یہ ضرورت تو اصل میں ان کے لیے ہے جو فی نفسہٖ بذاتہٖ فانی ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ٩٢﴾ ''اور رحمٰن کے تو یہ شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے''۔ سورۃ الانعام کی بڑی پیاری آیت ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ

صَاحِبَةٌ ؕ﴾ (آیت۱۰۲)

''وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ کوئی اس کی شریک زندگی (بیوی) ہی نہیں ہے؟''

اس لیے کہ اللہ کے لیے بیٹا یا بیٹی مانو گے تو پہلے اس کے لیے کوئی بیوی بھی ماننا پڑے گی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اللہ کے لیے کوئی بھی بیوی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تو کیسے اس کے اولاد ہو جائے گی؟ وہ تو ''البدیع'' ہے۔ یہاں ''بدیع'' کے دونوں مفہوم ذہن میں رکھئے۔ ایک مفہوم ہے کائنات کو عدمِ محض سے وجود بخشنے والا۔ بدیع کا دوسرا مفہوم ہے انوکھی چیز' بے مثل چیز۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی وہ شان بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ بے مثل ہے' اپنی ذات میں بالکل انوکھا ہے' اس کی کوئی بیوی نہیں' تو اس کی اولاد کہاں سے ہو جائے گی؟

اس ضمن میں قرآن مجید نے مشرکین عرب کے ذکر میں کچھ لطیف طنز بھی کیے ہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے تو بزعم خویش اللہ کو بیٹے دیے' لیکن تم نے تو کمال کیا کہ الاٹ بھی کیں تو بیٹیاں کیں! ارشادِ الٰہی ہے : ﴿اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''(یہ بڑی عجیب بات ہے کہ) تمہارے ربّ نے تمہیں تو بیٹے عطا کر دیے' اور خود اپنے لیے اس نے فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا؟ یقیناً تم بڑی بھاری بات اپنی زبان سے نکال رہے ہو۔'' سورۃ النجم میں فرمایا گیا: ﴿اَلَـكُمُ الذَّكَرُ وَلَـهُ الۡاُنۡثٰى ﴿۲۱﴾ تِلۡكَ اِذًا قِسۡمَةٌ ضِيۡزٰى ﴿۲۲﴾﴾ ''کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بڑی ہی غیر منصفانہ ہے۔'' اس لیے کہ تم نے اسے الاٹ بھی کی ہیں تو بیٹیاں کی ہیں۔ یہی بات سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں فرمائی گئی: ﴿اَصۡطَفَى الۡبَنٰتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَـكُمۡ ۟ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾﴾

''کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کو چھوڑ کر (اپنے لیے) بیٹیاں اختیار کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگا رہے ہو؟''

البتہ یہ بات مسلّمہ ہے کہ گزشتہ اقوام میں سے جو قومیں بھی شرک فی الذات میں مبتلا ہوئیں ان میں سے کسی نے بھی اللہ کے لیے بیوی تسلیم نہیں کی۔

عیسائیت کے بارے میں یہ بات جان لیجیے کہ اگرچہ عیسائیوں میں اس شرک ''شرک فی الذات'' نے سب سے زیادہ بدترین صورت اختیار کی اور یہ شرک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا' لیکن عیسائیوں میں بھی جو دو تثلیثیں رائج رہی ہیں اُن میں پہلی تثلیث (Trinity) جو ابتدا میں زیادہ مانی جاتی تھی وہ یہ ہے:

God the Father, Mary the mother and Jesus the son.

یعنی باپ' بیٹا اور ماں تین الٰہ ہیں اور اس تثلیث میں حضرت مریم سلامٌ علیہا ماں کے رشتے سے الوہیت میں شریک ہیں' خدا کی بیوی ہونے کی حیثیت سے نہیں! اور اس میں بڑا فرق ہے۔ اِس جدید دور میں اس تثلیث کو ماننے والے بہت کم عیسائی ہیں۔ اب جو تثلیث رائج ہے' جو نسبتاً زیادہ فلسفیانہ ہے' وہ یہ ہے:

God the Father, Jesus the son and the Holy Spirit (Ruh-ul-Qudus).

یعنی باپ' بیٹا اور روح القدس۔ اس تثلیث میں سے حضرت مریم سلامٌ علیہا کو نکال دیا گیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اس شائبہ سے بچنے کے لیے کیا گیا جو اللہ کے لیے بیوی ہونے کا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انسانی ذہن غیر شعوری طور پر اُدھر منتقل ہو سکتا تھا اور یہ انسانی ذہن کو بہت برا اور نامناسب محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو تثلیث عیسائیوں کے ہاں رائج ہے' وہ ہے ''باپ' بیٹا اور روح القدس'' کی تثلیث۔

شرک فی الذات کی دوسری صورتیں

شرک فی الذات کی جو دوسری صورتیں ہیں وہ فلسفیانہ مذاہب میں رائج رہی ہیں۔ فلسفیانہ مذاہب کی مکمل ترین اور نمایاں ترین مثالیں ہندوستان کے مذاہب ہیں۔ ہندو مت اصل میں کوئی ایک مذہب نہیں ہے' بلکہ یہ بہت سے مذاہب کا مجموعہ ہے۔ ان میں وہ مذاہب بھی ہیں جو خدا کا سرے سے انکار کرتے ہیں' وہ مذاہب بھی ہیں جو شدید ترین شرک کے اندر مبتلا ہیں' اور ان کے برعکس ان میں وہ مذاہب بھی ہیں جو توحید کی بہت اونچی چوٹی پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بدھ مت بھی بظاہر احوال جیسا بھی نظر آتا ہے' ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ جین مت بھی ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ تاؤازم اور کنفیوشسزم بھی فلسفیانہ

مذاہب ہیں۔ اسی طرح یہ جو ہند چینی (Indo Chinese) مذاہب ہیں' ان سب کی بنیاد فلسفہ ہے۔ اگرچہ ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے' لیکن گوتم بدھ کے بارے میں بعض محققین کا گمان ہے کہ وہ حضرت ذوالکفلؑ تھے' کپل وستو والے۔ یعنی کپل کا ''پ''، ''ف'' سے بدل گیا تو ذوالکفل ہو گیا (واللہ اعلم)۔ بہرحال ان فلسفیانہ مذاہب میں شرک کی جو یہ دو صورتیں اور شکلیں بنیں ان کو جان لیجیے۔

ایک شکل وہ ہے جسے انگریزی میں Pantheism سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ''ہمہ اوست'' ہے' اگرچہ اس کو خلطِ مبحث کیا جاتا ہے عقیدہ ''وحدت الوجود'' سے' جو ہمارے ہاں کے بعض حکماء' فلاسفہ اور صوفیاء کی اکثریت کا عقیدہ ہے۔ بعض لوگ ناسمجھی میں ''ہمہ اوست'' کو وحدت الوجود کے مترادف یا وحدت الوجود کو ہمہ اوست کے مترادف قرار دے دیتے ہیں۔

شرک فی الذات کی دوسری نمایاں شکل وہ ہے جسے انگریزی میں Incarnation اور ہندی میں ''اَوتار'' کا عقیدہ کہا جاتا ہے' اور عربی کا لفظ ''حلول'' تقریباً ان دونوں صورتوں کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اب پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ ہمہ اوست یا Pantheism کیا ہے۔ یہ اصل میں فلسفۂ وجود کی ایک بحث ہے۔ ہندوستان میں بعض لوگ دو ہستیوں کو قدیم مانتے ہیں' یعنی خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم۔ ان کے خیال میں تخلیق کا عمل خدا اور مادّے کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے۔ جیسے ایک بڑھئی لکڑی سے کرسی' میز یا منبر بنا دے' تو کرسی' میز یا منبر بنانے والا بڑھئی بھی پہلے سے موجود تھا اور وہ لکڑی بھی پہلے سے موجود تھی جس سے یہ چیزیں بنائی گئیں۔ اسی طرح خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم ہے' اور خدا نے مادے سے یہ مختلف شکلیں بنا دی ہیں۔ اس کو آپ ثنویت کہہ لیجیے کہ دو ہستیوں کو قدیم ماننا۔ اس کے علاوہ ایک عقیدہ اُن کا رہا جو تین اشیاء کو قدیم مانتے ہیں' یعنی خدا بھی قدیم' مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ وہ خدا اور مادے کے ساتھ روح کو بھی قدیم مانتے ہیں کہ وہ بھی ہمیشہ سے ہے۔ یہ ''تعدّدِ قدماء'' کا عقیدہ ہے کہ قدیم ہستیاں ایک سے زائد دو یا تین مان لی گئیں اور یہ بھی ایک طرح

کی تثلیث ہے۔

لیکن جو نسبتاً توحید کے ماننے والے تھے' جنہوں نے نہ روح کو قدیم مانا اور نہ مادے کو' بلکہ صرف خدا کو قدیم مانتے تھے' اب انہوں نے توحید سے شرک نکال لیا۔ ان کے لیے یہ بڑا اشکال پیدا ہوا کہ پھر خدا نے اس دنیا کو کیسے بنایا؟ اس لیے کہ جب کوئی شے پہلے سے تھی ہی نہیں اور صرف وہی قدیم ہے' یعنی نہ مادہ قدیم' نہ روح قدیم تو یہ دنیا کیسے وجود میں آ گئی؟ تو اس کی ایک شکل انہوں نے یہ قرار دی اور یہ عقیدہ وجود میں آیا کہ خدا نے خود ہی اس کائنات کا روپ دھار لیا۔ جیسے برف پگھل کر پانی بن جائے تو اب برف ہی پانی ہے' یعنی برف ہی نے پانی کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس پانی کو آپ نے آگ دی تو وہ بھاپ بن گیا۔ تو اب یہ بھاپ ہی پانی ہے اور بھاپ ہی برف ہے۔ اسی طرح اُن کے خیال میں خدا نے کلیتاً یا جزواً اس کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس عقیدے کی بھی دو شکلیں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ خدا اب رہا ہی نہیں' بلکہ خدا کُل کا کُل اس کائنات کی شکل میں ڈھل گیا ہے' اب علیحدہ سے خدا کے نام سے کوئی شے نہیں۔ اور دوسری شکل یہ کہ خدا کے کسی جزو نے اس کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ یعنی اگرچہ خدا بھی موجود ہے' لیکن یہ کائنات بھی اس کا جزو ہے' یا یہ اسی کے جزو کی ایک شکل ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصورات ہیں کہ (نعوذ باللہ) خدا کے سر سے برہمن پیدا ہوئے' بازوؤں سے کھشتری پیدا ہوئے جو لڑنے والے ہیں' اور اس کے پاؤں سے شودر پیدا ہوئے۔ یہ تصورات اسی عقیدے کا ایک منطقی ربط ہیں۔ اس عقیدے کے فلسفیانہ پہلو پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب ہر چیز الوہیت کی حامل ہے۔ اس لیے کہ جب خدا ہی نے کائنات کا روپ دھار لیا ہے تو پھر درخت بھی خدا ہیں' سورج بھی خدا ہے' چاند بھی خدا ہے' کیڑے مکوڑے بھی خدا ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ بدترین شرک ہے جو آپ کو ہندوستان کی سرزمین میں ملے گا۔

صرف خدا کو قدیم ماننے والوں میں سے بعض نے اس طرح پیدا شدہ اشکال کے ازالے کے لیے ایک دوسری شکل یہ اختیار کی کہ خدا انسانوں کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے' یعنی کسی ایک انسان میں حلول کر جاتا ہے۔ یہ اَوتار یا Incarnation کا عقیدہ ہے۔

چنانچہ ان کے نزدیک رام چندر جی اور کرشن جی خدا کے اوتار ہیں۔ ان کے ہاں نو اَوتار تھے۔ ایک دسواں اوتار اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں نے ان میں شامل کر لیا ہے، جس کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ بہرحال ہمہ اوست (Pantheism) اور اَوتار بن جانے یا حلول کر جانے (Incarnation) کا عقیدہ شرک فی الذات کی وہ صورت ہے جو فلسفیانہ مذاہب میں رائج ہے۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ پر خصوصی فضل و کرم

اب ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر ہم اُمت مسلمہ کا جائزہ لیں کہ اس نوع کا شرک ہمارے ہاں آیا یا نہیں، اور اگر آیا تو کس سطح پر اور کس حد تک! اس ضمن میں سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، اور میرا گہرا احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس اُمت پر بڑا فضل و کرم ہوا کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود اس نوع کا کوئی عقیدہ مسلمانوں کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند عقائد کی فہرست میں موجود نہیں ہے۔ یہ اللہ کا بڑا فضل اور ایک قسم کا معجزہ ہے۔ حالانکہ اس اُمت کو جو عقیدت اور محبت رہی ہے اپنے رسول ﷺ سے اس کا پاسنگ بھی نہیں ہے وہ محبت اور عقیدت اور وہ جاں نثاری جو کسی دوسرے رسول کے اُمتیوں کو اپنے رسول کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کو خدا کا بیٹا یا خدا نہیں بنایا گیا۔ عوام کالانعام کے ہاں، واعظوں اور نعت گوؤں کے ہاں اور اُن شاعروں کے ہاں جو ﴿فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ﴾ کا نقشہ پیش کر رہے ہوں، اس قسم کے اشارات اور کنائے مل جاتے ہیں اور یہ صرف ایہام کی حد تک ہے۔ ''ایہام'' کا مطلب ہے کہ بات صاف اور واضح نہ کی جائے کہ جس پر گرفت ہو، لیکن سامع کے ذہن میں ایک وہم اور ایک خیال ابھار دیا جائے۔ اس نوعیت کی باتیں شاعروں، واعظوں اور نعت گوؤں نے کی ہیں، جن کے شرکیہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مثلاً یہ شعر کہ:

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ﷺ ہو کر

اب آپ دیکھئے کہ اس میں اور اوتار کے عقیدے میں کیا فرق ہے؟ لیکن ذہن میں رکھیے کہ

یہ ایک شاعر کی مبالغہ آرائی ہے۔ یہ اس درجے کی چیزیں اور اس طرح کے استعارے ہیں جن سے شاعری کی دکان چلتی ہے۔ اس طرح کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر
بغیر عین کا اِک عرب ہم نے دیکھا!

اب لفظ ''عرب'' میں سے ''عین'' نکال دیجیے تو ''رب'' رہ جائے گا۔ یعنی رسولِ عربی ﷺ اصل میں ربّ ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ شعر میں بات واضح نہیں کی گئی اور آپ گرفت کریں گے تو کہا جائے گا ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ کہ ایک وہم اور خیال پیدا کر دیا، ذہن کو اُدھر موڑ دیا، اور سننے والوں میں جو زیادہ خوش عقیدہ ہوں گے انہوں نے واہ واہ کی ہو گی اور داد دی ہو گی۔ تو اس طرح کی باتیں جہلاء اور عوام کالانعام کے تحت الشعور کے اندر پروان چڑھتی چلی گئی ہیں، لیکن ہمارے ہاں کے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا شائبہ یا اشارہ تک نہیں ہے۔ اور یہ میرے نزدیک معجزہ ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اور اصل میں اس کا براہِ راست تعلق ہے ختمِ نبوت کے ساتھ۔ دراصل یہ تحفظ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو عطا فرمایا کہ آپ ﷺ اس غلو کا ہدف اور نشانہ نہیں بنے۔ یہ ختم نبوت کے لوازم میں سے ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا خود ذمہ لیا، از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی یہ الذکر (قرآن حکیم) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ اور دوسری طرف محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو حفاظت عطا فرمائی کہ ان کی شخصیت مسخ نہ ہو جائے، وہ کہیں اَوتار نہ بنا دیے جائیں، وہ بھی کہیں خداؤں کی فہرست میں شامل نہ ہو جائیں، انہیں کہیں خدا کا بیٹا نہ بنا دیا جائے۔ تو یہ درحقیقت ایک تحفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیٔ اکرم ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ اس کا زیادہ اندازہ آپ کو اُس وقت ہو گا جب آپ اس حقیقت کو سامنے رکھیں گے کہ یہ معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

حضرت علیؓ کی نسبت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک اُمتی کی ہے، چنانچہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے کم از کم ایک درجہ تو نیچے لائیں گے۔ ویسے تو اہل سنت کے

نزدیک نبی اکرم ﷺ کے بعد درجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ لیکن اُمتیوں کو ایک ہی کیٹیگری شمار کرنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے کم از کم ایک درجہ تو نیچے ہیں' لیکن آپ سوچیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہنے والے پیدا ہو گئے۔ خدا کا بیٹا بھی نہیں بلکہ خود انہیں خدا بنا دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بدترین عقیدے کی پاداش میں زندہ آگ میں جلوایا ہے۔ یہ ایک یہودی سازش تھی اور اس سازش کو کامیاب کرنے کے لیے لوگوں نے پورے استقلال کے ساتھ جانیں دی ہیں۔ اس لیے کہ قربانی دیے بغیر کسی بھی سازش کی آگ آگے نہیں بڑھتی۔ ہمارے ہاں جہلاء میں جو نعرہ مروّج ہے وہ ''یا علی مدد'' کا ہے ''یا محمد ﷺ مدد'' کا نہیں ہے۔ ''یا محمد'' / ''یا رسول اللہ'' تو محض اپنے تشخص کو نمایاں کرنے کے لیے مسجدوں میں لکھنے کے کام آتا ہے' یا یہ نعرہ ایک خاص فرقے کے اجتماع یا جلسہ کے اندر لگوایا جاتا ہے' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ مسجد فلاں فرقے کی ہے اور یہ جلسہ فلاں گروہ کا ہے۔ باقی یہ کہ جو نعرہ میدان میں لگتا ہے وہ ''یا محمد ﷺ مدد'' کا نہیں' بلکہ ''یا علی مدد'' کا ہوتا ہے۔ تو الوہیت کا یہ معاملہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا۔

مسند احمد میں یہ حدیث موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک مشابہت پائی جاتی ہے کہ (ایک طرف) اُن سے یہود نے بغض رکھا حتیٰ کہ ان کی والدہ محترمہ پر (بدکاری کی) تہمت لگائی' اور (دوسری طرف) نصاریٰ نے ان سے انتہائی محبت کی' حتیٰ کہ انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جو اُن کا مقام نہیں۔'' یہ دو انتہائیں ہیں۔ ایک گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عقیدت میں اس قدر غالی ہو گیا کہ اس نے انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا اور ایک گروہ اُن کی دشمنی میں اس انتہا کو پہنچا کہ انہیں (معاذ اللہ) ولد الزنا قرار دیا اور اپنے بس پڑتے انہیں سولی پر چڑھا کر دم لیا۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہو کر رہا کہ حضرت علیؓ کو خدا کہنے والے بھی پیدا ہوئے اور خوارج کا وہ فرقہ بھی پیدا ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (نعوذ باللہ) کافر اور واجب

القتل کہتا تھا اور انہی میں سے ایک فرد نے بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

اب آپ اس پس منظر میں دیکھئے کہ الحمد للہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو نہ تو خدا کا بیٹا کہا گیا اور نہ ہی خدا کہا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کا خصوصی تحفظ ہے کہ اس نوع کا کوئی بھی خیال ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا' شاعری اور نعت گوئی کی حد تک ایسی حرکات ضرور سرزد ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ نعت کہتے ہوئے حدود کے اندر رہنا اکثر و بیشتر بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر نے بالکل صحیح بات کہی ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

چنانچہ نعت گوئی میں کچھ عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے' ہوش کا دامن ہاتھ میں نہیں رہتا۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ بڑے سے بڑے ممدوح شخص کی ممدوحیت بھی حق کو تسلیم کرنے میں اور باطل کے ابطال میں ہمارے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔ معصوم صرف نبی ہوتے ہیں اور نبوت ختم ہو گئی محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر۔ اپنی ذات میں حجت تو نبی اکرم ﷺ ہی تھے۔ باقی سب کو تو پرکھا جائے گا قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر۔ جو اِس پر صحیح اترے وہ صحیح ہے۔ کسی بھی شخص کو ہم یہ درجہ نہیں دے سکتے کہ وہ جو چاہے کہہ دے ہم اسے تسلیم کر لیں گے' بلکہ اس کی جو بات صحیح ہے وہ تسلیم کریں گے اور جو غلط ہے اس کو ردّ کر دیں گے۔ کسے باشد!

بہرحال ہمارے ہاں شاعری اور نعت گوئی کی حد تک اَوتار کے عقیدے کے خیالات موجود ہیں اور صفاتِ الٰہی میں نبی اکرم ﷺ کو اللہ کا ہم پلہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ بحث ان شاء اللہ ''شرک فی الصفات'' کے ذیل میں تفصیل سے آئے گی۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' آپ کو مسلمانوں کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند علماء کے ہاں ایسی چیز نہیں ملے گی۔ اہل علم جب بات کریں گے تو ان کی بات کے اندر توازن ہو گا' اور وہ ان علمی احتیاطوں کو ملحوظ رکھ کر بات کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان ذرا سا بھی غیر محتاط ہو جائے تو وہ شرک کے دامن میں جا پہنچتا ہے۔

اسی طرح جب وحدت الوجود کا عقیدہ ہمارے ہاں شعراء کا تختۂ مشق بن گیا تو اس کی

بھی جو تعبیریں عوام تک پہنچی ہیں وہ ہمہ اوست اور اَوتار والی ہیں۔ ہمہ اوست کی تعبیر ہمارے ہاں اس شعر میں ملتی ہے:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود رندِ سبو کش
خود برسرِ آں کوزہ خریدار بیامد
بشکست و رواں شد

برتن بنانے والا مٹی لے کر اس کو چکر پر چڑھاتا ہے تو ایک نئی چیز یعنی برتن وجود میں آ جاتا ہے۔ اب ویسے تو یہ تین چیزیں ہو گئیں۔ ایک خود برتن بنانے والا' دوسرا وہ برتن یا کوزہ اور تیسری چیز وہ مٹی یا گارا جس سے برتن وجود میں آیا۔ لیکن اس شعر کی رو سے اصل میں یہ تین نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی ہے۔ اب وہ برتن بنانے والا خود ہی اس کوزے میں شراب بھی پی رہا ہے۔ پھر خود ہی اس نے خریدار بن کر اس کو خریدا' اور پھر اس کو توڑا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ جو سارا تماشا ہے یہ اُس ہمہ اوست کی تعبیر ہے۔ ویسے یہ شاعری اتنی بلند ہے' ترکیبیں اتنی چست اور آہنگ ایسا دلکش ہے کہ آدمی جھوم جاتا ہے۔ اگلے شعر میں یہاں تک کہا گیا:

در برقعۂ جبریل بود نازلِ قرآں
آں چشمۂ وحدت
آخر بہ جہاں صورتِ آں یار برآمد
محبوبِ جہاں شد!

یعنی جبرئیل کا لبادہ بھی اُس نے خود ہی اوڑھا' قرآن کا نازل کرنے والا بھی وہ خود ہے اور آخر کار نبی اکرم ﷺ کی شکل میں وہ (خدا) دنیا میں خود ہی آ گیا' اور محبوبِ جہاں بن گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!)

اب دیکھئے اس میں ہمہ اوست اور اوتار دونوں طرح کے تصورات جمع ہیں۔ شاعری اگرچہ بہت پیاری اور وجد میں لانے والی ہے' لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی! اسی لیے کسی نے بڑی پیاری بات کہی ہے: ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار!'' یعنی آپ اللہ کی

جتنی تعریف کر سکیں کرتے چلے جائیں' تب بھی آپ اس کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتے' لیکن حضرت محمد ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے بہت محتاط اور چوکس رہنا پڑے گا۔ کسی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی معرفت کا حق ادا کر سکے۔ اس ضمن میں لامحالہ یہی کہنا پڑے گا:

مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ

''اے ربّ! ہم نے تیری بندگی نہیں کی جتنا کہ تیری بندگی کا حق تھا اور تیری معرفت حاصل نہیں کر سکے جتنا کہ اس کا حق تھا۔''

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز میدانِ حشر میں' جب دربارِ خداوندی لگا ہوگا' حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں اُس روز اپنے ربّ کی وہ حمد کروں گا جو آج نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ حمد ہوتی ہے معرفت کی نسبت سے اور معرفت نبوی ﷺ کسی ایک جگہ آ کر ٹھہر نہیں گئی' بلکہ اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہی' درجات بلند سے بلند تر ہوتے رہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴﴾ (الضحٰی) ''اور ہر آنے والی ساعت آپ کے لیے ہر پہلی ساعت سے بہتر ہے''۔ تو جیسے جیسے معرفتِ خداوندی کی منازل طے ہو رہی ہیں حمد کے درجات بھی بلند ہو رہے ہیں۔ جتنا آپ ربّ کو پہچانیں گے اتنی ہی اس کی حمد کر سکیں گے! چنانچہ آپ اللہ تعالیٰ کی جتنی حمد بھی کر لیں' پھر بھی اس کی حمد ادا نہیں ہوتی' ع ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں انتہائی ہوشیار رہنا ہوگا۔ ع ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!'' کے مصداق یہاں انسان کا قدم تلوار کی دھار پر ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ (النساء: ۱۷۱) ''اپنے دین میں غلو ہرگز نہ کرو''۔ یہ غلو ہی تو تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا گیا' حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا گیا۔ یہ محبت اور عقیدت کا غلو ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی مدح' تعریف اور ثناء کے بیان میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جہلاء اور عوام کالانعام سے قطع نظر ہمارے ہاں کے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں الحمد للہ اس احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

شخصیتِ محمدی ﷺ کے تحفظ کے اسباب

اس ضمن میں باطنی طور پر تو اصل دخل ہے حکمت خداوندی کو کہ یہ تحفظِ خصوصی ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا' لیکن اس میں دو چیزیں اور ہیں جو ظاہری اسباب میں سے ہیں۔ جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا اصل سبب تو ہے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اللہ تعالیٰ کا ذمہ' لیکن ظاہری اسباب میں یہ حفظِ قرآن کا جو معاملہ چلا' یہ اس کا ذریعہ ہے۔ یہ قرآن صرف کتابوں ہی میں نہیں ہے' ﴿بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ﴾ (العنکبوت:٤٩) ''بلکہ یہ کھلم کھلا آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں''۔ فن قراءت کی کتابیں تو بعد میں لکھی گئی ہیں۔ قرآن حکیم تو ایک زبان نے دوسری زبان سے سیکھا ہے' اور یہ ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوا ہے' اور اب لاکھوں کی تعداد میں حفاظِ کرام موجود ہیں۔ پھر رمضان المبارک اور تراویح کا نظام ہے جس میں حفظ کو تازہ کیا جاتا ہے۔ تو یہ سارا سلسلہ حفاظتِ قرآن مجید کے ظاہری اسباب میں سے ہے' جس کے باطن میں دراصل مشیتِ خداوندی کارفرما ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کو جو تحفظ ملا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ وہ ظلم روا نہیں رکھا گیا' درآں حالیکہ آپ ﷺ کے ایک اُمتی پر وہ ظلم ہو گیا' تو اصل میں تو یہ مشیتِ الٰہی ہے' لیکن اس کے ظاہری اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا یہ مضمون مختلف پیراؤں میں آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (الکہف:١١٠)

''(اے نبی ﷺ!) کہیے کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا' میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے''۔

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف' جو دو جڑواں سورتیں ہیں' ان میں اہل علم کے لیے ایک عجیب نکتہ ہے کہ ان دونوں کی آخری دو دو آیات فعل امر ''قُلۡ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَمۡ يَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرۡهُ تَكۡبِيۡرًا ﴿١١١﴾﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا' نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ کوئی اس کا دوست ہو' اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجے کی بڑائی''۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ کی شانِ تنزیہی کو خوب نمایاں کیا گیا ہے' مبادا کہیں اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ بلند سے گرا دیا جائے۔ اس لیے کہ شرک کی دو ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوقات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر خدا کے برابر بٹھا دیا جائے۔ ان کے علاوہ تیسری صورت تو ممکن نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت نے شرک کی پہلی صورت کی جڑ کاٹی ہے' جبکہ دوسری صورت کی جڑ کاٹی ہے سورۃ الکہف کی آخری آیت نے بایں الفاظ: ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (الکہف:١١٠)

یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے۔ جب مشرکین عرب نے نبی اکرم ﷺ سے معجزات طلب کیے کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہمارے لیے فوراً ہی یہاں پر ایک چشمہ برآمد ہو جائے' یا ایک باغ تیار ہو جائے' یا ایک محل بن جائے' یا ہمیں آسمان پر چڑھ کر دکھائیں' تو ان سب باتوں کا یہ جواب دلوایا گیا: ﴿قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿٩٣﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے پاک ہے میرا پروردگار' میں تو صرف ایک انسان ہوں' جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ تم یہ مطالبے مجھ سے تب کرتے اگر میں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہوتا۔ میں نے خدائی کا دعویٰ تو نہیں کیا۔ ثبوت اور دلیل طلب کی جاتی ہے دعوے کی مناسبت سے۔ اگر میں نے الوہیت اور خدائی کا دعویٰ کیا ہوتا تو تمہارے مطالبے درست تھے کہ یہ کر کے دکھاؤ تو تمہیں خدا مانیں گے' جبکہ میں نے تو صرف ایک دعویٰ کیا ہے کہ میں ایک رسولِ بشر ہوں' لہٰذا مجھ سے اسی کی مناسبت سے کوئی دلیل طلب

کرو۔تو پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔

ایک بار بریلوی مکتب فکر کے ممتاز عالم دین صاحب زادہ فیض الحسن صاحب نے اپنی تقریر میں اپنے مخالفین پر بڑے لطیف پیرائے میں تنقید کی' جو مجھے پسند آئی۔انہوں نے اپنے ہم مسلک اور ہم مشرب لوگوں کے سامنے مخالفین کو للکار کر کہا کہ: ''کیا تم ہمیں پاگل اور جاہل سمجھتے ہو؟ کیا ہم قرآن نہیں پڑھے ہوئے یا ہم عربی نہیں جانتے؟ ہم خوب جانتے ہیں کہ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کو بشر کہا ہے۔ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ تم آپ ﷺ کی بشریت کو زیادہ نمایاں نہ کرو' بشر بشر کی رٹ نہ لگاؤ کہ یہ سوئے ادب ہے۔اس لیے کہ تمہارے والد کا نام اگر عبدالرحمٰن ہے تو تم اسے عبدالرحمٰن کہہ کر نہیں پکارتے' ابا جان کہتے ہو!'' بہرحال قرآن مجید جس طرح سے نبیٔ اکرم ﷺ کی بشریت کو نمایاں کر رہا ہے تو یہ کسی حکمت کی وجہ سے ہے۔فِعۡلُ الۡحَکِیۡمِ لَا یَخۡلُوۡ عَنِ الۡحِکۡمَۃِ کے مصداق لازماً اس کی کوئی ضرورت ہے' لازماً کوئی فتنہ ہے جس کا سدّ باب مقصود ہے۔چنانچہ اس مقصد اور حکمت کے تحت اس کو بیان کرنا ہوگا۔البتہ ضدّم ضدّا کا معاملہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

اسی ضدّم ضدّا کی مثال کے طور پر میں نام لیے بغیر ایک دوسرے مکتب فکر کے ایک بہت بڑے عالم دین کا واقعہ پیش کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے! جس کی مجھے تحسین کرنی تھی اس کا نام لے کر بات کی ہے اور جس پر تنقید کرنی ہے اس کا نام نہیں لینا چاہتا۔وہ صاحب پنجابی میں سیرت النبی ﷺ پر ملی جلی تقریر کر رہے تھے' جس میں تفسیر بھی تھی' سیرت بھی تھی اور اختلافی مسائل بھی تھے۔واقعہ یہ ہے کہ اُس اللہ کے بندے نے پوری تقریر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے نام کے ساتھ کہیں بھی ''حضرت'' اور ''رضی اللہ عنہ'' نہیں کہا۔جب بیعت رضوان کا واقعہ سنایا تو اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں انہوں نے کہا: (اردو ترجمہ) ''ارے! عثمان زندہ ہے اور اِدھر بیعت ہو رہی ہے! تو کہاں گیا تمہارا علم الغیب؟'' یہ آگ کو ہوا دینے کا سا ایک انداز ہے اور ایک رسہ کشی کا معاملہ ہے۔ورنہ یہ کہ ان معاملات کو ہم حل کرنے پر آئیں تو قطعاً کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔تو پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو تحفظ ہوا ہے رسول اللہ ﷺ کا اس میں بہت بڑا حصہ اس کا ہے کہ

قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔

اسی کے تابع دوسری بات سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔اگر کہیں ذرا سا بھی وہم پیدا ہونے کا امکان نظر آیا تو وہاں پر بھی نبیٔ اکرم ﷺ نے فوراً ٹوک دیا۔مثلاً تعظیماً کھڑے ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔کوئی بزرگ ہستی آئے تو آپ کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ اس کی تعظیم ہے۔لیکن نبی اکرم ﷺ نے اپنے لیے اسے بھی پسند نہیں کیا' بلکہ آپ ﷺ صحابہؓ کو اس سے سختی سے روکتے تھے۔ایک صحابیؓ کی زبان سے گفتگو میں یہ الفاظ نکل گئے: ''مَا شَاءَ اللّٰہُ وَمَا شِئۡتَ ''یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ ﷺ چاہیں۔اس پر آپ ﷺ نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلۡتَنِیۡ لِلّٰہِ نِدًّا؟ مَاشَاءَ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ))(۱) ''کیا تم نے مجھے اللہ کا مدّ مقابل بنا دیا؟ (بلکہ وہی ہوگا) جو تنہا اللہ چاہے!'' یہاں آپ ﷺ نے ''نِدّ'' کا لفظ استعمال کیا جس کی جمع ''اَنداد'' ہے۔قرآن مجید میں ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُس کے مدّ مقابل بناتا ہے' اور پھر یہ لوگ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں''۔تو نبی اکرم ﷺ نے اتنا سخت لفظ استعمال کیا کہ تم نے مجھے اللہ کا نِدّ (مدمقابل) بنا دیا؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ ان صحابیؓ کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔لیکن چونکہ اُن کا یہ جملہ وہم پیدا کر سکتا تھا اور مساوات کی شکل ذہن میں آ سکتی تھی' لہٰذا آپ ﷺ نے سختی سے ٹوک دیا۔اس لیے کہ مشیت تو صرف اللہ کی ہے۔آپ ﷺ کی شان تو یہ ہے کہ: ﴿اِنَّکَ لَا تَہۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵۶) ''(اے نبی ﷺ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں (یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے)' بلکہ اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔

تیسری بات جو مَیں کرنے لگا ہوں وہ ذرا حساس (sensitive) بحث ہے۔

(۱) ان الفاظ میں یہ حدیث علامہ محمد بن عبدالوہاب نے ''کتاب التوحید'' میں نسائی کے حوالے سے درج کی ہے۔مسند احمد میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((اَجَعَلۡتَنِیۡ وَاللّٰہَ عَدۡلًا)) ''کیا تو نے مجھے اور اللہ کو برابر کر دیا؟'' (مرتب)

قرآن مجید میں نہ صرف نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو نمایاں کیا گیا بلکہ اگر کہیں آپ ﷺ سے بتقاضائے طبع بشری معمولی سی خطا یا چوک بھی ہوئی (ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی زبان لڑکھڑاتی ہے) تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ٹوکا اور گرفت فرمائی اور اس گرفت کو ہمیشہ ہمیش کے لیے قرآن مجید کا جزو بنا دیا' تاکہ تمام کلمہ گو' تمام اُمتی ہمیشہ پڑھتے رہیں کہ یہ گرفت ہوئی تھی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد ہوا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی③ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی⑥ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ⑦ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ⑧ وَهُوَ يَخْشٰی ⑨ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ⑩ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ⑪ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ⑫﴾

''تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا' اس لیے کہ ان کے پاس آیا ایک اندھا۔ آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیۂ نفس حاصل کرتا یا وہ نصیحت اخذ کرتا تو نصیحت اسے فائدہ پہنچاتی۔ جو شانِ استغناء کا مظاہرہ کر رہا ہے' اس کی طرف آپ توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ تزکیہ حاصل نہ کرے تو آپ پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو آپ کے پاس دوڑ کر آیا' اور اس کے اندر خشیت ہے' تو آپ اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ ہرگز نہیں' یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ پس جو چاہے اس یاددہانی کو اخذ کرے''۔

اسی طرح غزوۂ اُحد کا واقعہ ذہن میں لائیے جس پر رسول اللہ ﷺ کی گرفت ہوئی' حالانکہ آپ ﷺ میں وہ پہاڑ جیسی عزیمت تھی کہ کوہ ہمالیہ بھی جس پر رشک کرے۔ یومِ طائف میں یہ عزیمتِ محمدی ﷺ خوب ظاہر ہوتی ہے۔ پتھراؤ سے جسم لہولہان ہے' زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی جاں نثار ساتھ نہیں ہے۔ اندازہ کیجیے کہ سائے کی طرح آپ ﷺ کے ساتھ رہنے والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی سفرِ طائف میں آپ ﷺ کے ہمراہ نہیں تھے۔ آپ ﷺ کا استہزاء ہوا' فقرے چست کیے گئے' طائف کے تینوں رؤسا نے ایک سے ایک بڑھ

کر کلیجے کو چھید دینے والے الفاظ استعمال کیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اوباشوں نے جس طرح آپ ﷺ کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا وہ ناقابل بیان ہے۔ لیکن اُس وقت بھی جبکہ آپ ﷺ کو اختیار دیا گیا کہ اگر آپ ﷺ چاہیں تو مَلَک الجبال ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دے اور طائف کے رہنے والے ان کے مابین سرمہ بن جائیں' عزیمتِ محمدی ﷺ کوئی بددعائیہ کلمہ زبان سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ بلکہ زبانِ رحمت سے ارشاد ہوا کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے! لیکن غزوۂ اُحد میں جب دندانِ مبارک شہید ہوئے اور چہرۂ انور لہولہان ہوا تو زبان سے یہ جملہ نکل گیا: ((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ اِلَى اللّٰهِ)) [1] ''وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگ دیا' جبکہ وہ انہیں اللہ کی طرف پکار رہا تھا!'' حالانکہ یہ کوئی بددعا نہیں تھی کہ اے اللہ! ان کو ہدایت نہ دیجیو' بلکہ یہ ایک تبصرہ تھا۔ لیکن اس پر گرفت ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ﴾ (آل عمران:١٢٨) ''(اے نبی!) آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے (ہدایت اور ضلالت کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) وہ چاہے گا تو اُن کی توبہ قبول کرے گا اور اگر چاہے گا تو اُن پر عذاب بھیج دے گا''۔ یہ فیصلہ اے نبی ﷺ! آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے' ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ اپنا کام کیجیے اور ان کے انجام کو ہمارے حوالے کیجیے۔ ﴿اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ ㉕ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ㉖﴾ (الغاشية) ''یقیناً ہماری طرف ان سب کو لوٹ کر آنا ہے' پھر ہمارے ذمہ ہے ان کا حساب''۔ اور تاریخ کی اس حقیقت کو دیکھئے کہ اس پورے حادثۂ فاجعہ کا جو سب سے زیادہ ذمہ دار شخص ہو سکتا تھا' یعنی خالد بن ولید' اسی کو اللہ تعالیٰ نے لسانِ محمدی ﷺ سے خطاب دلوایا: ((خَالِدٌ سَيْفٌ مِّنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ)) ''خالد تو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے''۔ عالمِ اسباب میں تو غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی فتح کو شکست میں بدل دینے والے

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الفتن' باب الصبر على البلاء۔ و مسند احمد: ١٢٧٢٥۔ اس مضمون کی احادیث صحیح مسلم اور سنن ترمذی میں بھی موجود ہیں۔

خالد بن ولید ہی تھے' لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل فرما دیا۔ بہرحال قرآن مجید نے ان باتوں کو نمایاں کیا ہے تو حکمتِ بالغہ کے تحت کیا ہے۔ ایسے مقامات سے گزرتے ہوئے قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو گی کہ اگر یہ چیزیں قرآن میں نہ ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ ہمیں ان آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے اور ہماری زبان لڑکھڑاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِىَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿٧٤﴾﴾ (بنی اسراء یل)

''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ تو درپے تھے اس کے کہ آپ کو بچلا دیں اس وحی سے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپ ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ لائیں' اور تب تو یہ لازماً آپ کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم آپ کے پاؤں جمائے نہ رکھتے تو آپ تو ان کی طرف کسی درجے میں مائل ہو ہی جاتے۔''

اور اگلی آیت میں پھر اس پر تبصرہ ہوا ہے:

﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾﴾

''اگر ایسا ہو جاتا تو ہم لازماً آپ کو دوہری سزا دیتے دنیا کی اور دوہری سزا دیتے موت کی' پھر آپ کو ہمارے مقابلے میں اپنے لیے کوئی مددگار (اور کوئی چھڑانے والا) نہ ملتا''۔

مقصود یہ بتانا ہے کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اُسی طرح شرک کی آمیزش سے پاک اور صاف ہے۔ آپ ﷺ بشر ہیں اور رسول ہیں۔ آپ ﷺ عبدہٗ بھی ہیں اور رسولہٗ بھی ہیں۔ آپ ﷺ عبدِ کامل بھی ہیں اور رسولِ کامل بھی۔

اس شعر میں کتنی بڑی حقیقت بیان ہوئی ہے:

اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ
وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی

''ربّ ربّ ہی ہے چاہے وہ کتنا ہی نزولِ اجلال فرما لے' اور بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند مقام پر پہنچ جائے''۔

چودہ سو برس گزرنے کے باوجود یہ امتیاز قائم ہے' حالانکہ اس اُمت میں اپنے نبی ﷺ کے ساتھ محبت اور عقیدت میں کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں رہی ہے۔

بہرحال یہ حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے تحت ہے' اور یہ لازمی نتیجہ ہے ختمِ نبوت کا۔ لیکن اس کے اسبابِ ظاہری میں سے پہلا یہ ہے کہ قرآن مجید نے نبیٔ اکرم ﷺ کی بشریت پر بہت زور دیا ہے اور اسے بہت نمایاں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اگر کہیں صحابہ کرامؓ میں کوئی ایسا رجحان دیکھا کہ جس سے کسی دیکھنے والے کو مغالطہ ہو سکتا تھا تو اس پر آپ ﷺ نے نکیر فرمائی۔ اور تیسرے یہ کہ جہاں کہیں بھی بر بنائے طبع بشری آپ ﷺ سے کوئی خطا یا چوک ہوتی تھی' اگرچہ وہ جانبِ خیر ہی ہوتی تھی' تو اُس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت گرفت ہوتی۔ یہاں میں کسی مغالطے کے سدّ باب کے لیے وضاحت کر دوں کہ نبی کی غلطی کے لیے ''خطا'' کا لفظ موزوں ترین ہے۔ اس لیے کہ خطا میں نیت کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا سب سے نمایاں استعمال ہے ''نشانے کا خطا ہو جانا''۔ اب نشانچی کی تو نشانہ لگانے کی انتہائی کوشش ہوتی ہے' اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ نشانہ اِدھر اُدھر ہو' لیکن بعض اوقات نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس کے ارادے اور نیت سے بالکل باہر کا معاملہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ خطا میں نفسانیت نہیں ہوتی بلکہ خیر ہی کی طلب ہوتی ہے۔ یعنی نبی سے خطا ہوتی ہے تو جانبِ خیر میں ہوتی ہے' جانبِ شر میں نہیں ہوتی۔ سورۂ عبس کے واقعے کو پیش نظر رکھیے کہ یہ سارا معاملہ دین کی تبلیغ کے لیے تھا' دین کی اقامت کے لیے راستہ نکالنا مقصود تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے چاہا کہ ان چودھریوں اور سرداروں کی طرف توجہ اور التفات کروں گا تو ان میں سے اگر ایک بھی ایمان لے آتا ہے تو وہ ہزاروں کے برابر ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے جھولی پسار پسار کر دعا کی ہے کہ پروردگار! عمرو بن ہشام

یا عمر بن الخطاب میں سے ایک کو تو ضرور اسلام کی توفیق عطا فرما دے! اس لیے کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ان میں سے ایک جو ہے وہ ایک لاکھ کے برابر ہے۔ ایک ایمان لے آئے گا تو دین کو تقویت پہنچے گی۔ تو یہ سارا معاملہ محض دین کے لیے تھا' اس سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) کوئی اپنی ذاتی آسانی مطلوب نہیں تھی' کوئی اپنی ذاتی قدر و منزلت بڑھانی مقصود نہیں تھی۔ ان بڑوں کی طرف التفات اس لیے نہیں تھا کہ ان کی دولت کی طرف آپ ﷺ کی کوئی حریصانہ نگاہ تھی' (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) بلکہ یہ دین کی بہتری کے لیے اور ان مسلمانوں کی مصلحت کے لیے تھا جو چکی کے پاٹوں میں پسے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے چاہا کہ اگر ایسے چند بااثر لوگ ایمان لے آئیں تو ان کو بھی ریلیف ملے گا' انہیں بھی سہارا ملے گا' ان کو قوت اور تقویت حاصل ہوگی۔

بہرحال قرآن نے ان چیزوں کو جس طرح نمایاں کیا اور جو سخت اندازِ خطاب برتا ہے یہ درحقیقت اس وجہ سے ہے کہ مقامِ ربوبیت اور مقامِ عبدیت میں امتیاز قائم رہے۔ اور یہ صورت حال الحمدللہ' ثم الحمدللہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود برقرار رہی ہے۔ باقی یہ کہ ہمارے ہاں اگر کچھ اولیاء اللہ اور صوفیاء کی عقیدت میں کچھ غلو ہوا ہے تو جان لیجیے کہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق اگر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا مقام یہ ہے جو قرآن نے بیان فرمایا تو کسی اور کا ان سے اونچا مقام کیونکر ہو جائے گا؟ کسے باشد! بڑے سے بڑے پیر' بڑے سے بڑے صوفیاء اور بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا مقام بھی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسے ہے جیسے سورج کے سامنے ستارے ہوں' ان سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے ہاں جو مغالطے پھیلے ہوئے ہیں وہ محض اسی نوعیت کے ہیں جیسے میں نے بتایا' کہ جہلاء' شعراء' نعت گوؤں اور واعظوں نے اپنے غلوِ بیان میں یہ شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ بدقسمتی سے اس میں اَوتار (Incarnation) کا عقیدہ بھی آ گیا ہے اور ہمہ اوست (Pantheism) بھی آ گیا ہے اور اس میں ''بغیر عین کے اِک عرب'' سے خدا کا ایہام بھی پیدا کر دیا گیا ہے۔ آپ ان ساری چیزوں کو اسی کھاتے میں رکھیے اور اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود بھی اس اُمت مسلمہ کے کسی بھی مستند فرقے

کے مستند عقائد کی فہرست میں ''شرک فی الذات'' کی یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں۔ یعنی نہ تو کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا اور بیٹی قرار دیا گیا اور نہ ہمہ اوست اور اوتار کے عقائد پیدا ہوئے۔

مسئلۂ نور و بشر

شرک کی دوسری قسم ''شرک فی الصفات'' کی بحث شروع کرنے سے پہلے میں ایک اہم علمی نکتے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک مسئلہ مذہبی بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے۔ وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ''بشریت'' اور ''نور'' کا مسئلہ ہے کہ آپ ﷺ بشر تھے یا نور۔ عوامی سطح پر جو مذہبی جلسے ہوتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر اسی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے' دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں جن میں جوش و خروش اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کی بشریت کی نفی اور نورانیت کے اثبات پر اور دوسرا گروہ آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی اور بشریت کے اثبات پر بہت زیادہ زور لگاتا ہے جس سے مناظرے اور مباحثے کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ایک نزاع کا عالَم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نزاع کا قطعاً کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس سلسلے میں محض کھینچ تان اور جوشیلی تقریروں کی وجہ سے بات بگڑتی ہے اور فریقین میں باہم شدت اور تلخی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ بشر نہیں تھے بلکہ نور تھے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔ دونوں باتیں یکساں غلط ہیں' اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ بیک وقت بشر بھی تھے اور نور بھی تھے۔ اور یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہے بلکہ میرا اور آپ کا اور ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان کے اندر اس کے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کا ''حیوانی'' وجود ہے۔ وہ خاکیُ الاصل ہے جو اِس زمین سے بنا ہے۔ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ظُلمانی ہے۔ اس میں تاریکی ہے' اس میں پستی کا رجحان ہے' اس میں برائی کا میلان ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ج اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ م بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں' یقیناً نفس تو برائی

پر اُبھارتا ہے‘‘۔ لیکن انسان مجرد اِس پستی اور خاکیُ الاصل وجود ہی کا نام نہیں ہے‘ بلکہ اس کے وجود کا دوسرا حصہ ’’روح‘‘ ہے۔

نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی

انسانِ اوّل کو آدم علیہ السلام بنانے والی چیز یہی روحِ خداوندی تھی جو اُن میں پھونکی گئی۔ اور وہ روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے‘ بلکہ نورانی حقیقت رکھنے والی شے ہے۔ وہ ملائکہ کی ہم پلہ ہی نہیں ملائکہ کی مسجود ہے۔ ملائکہ نوری الاصل ہیں تو کیا روح خاکیُ الاصل ہے؟ نہیں‘ روح خاکی اور ظُلمانی نہیں ہے‘ بلکہ نورانی ہے۔ بقولِ اقبال:

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

حواسِ خمسہ یعنی دیکھنا‘ سننا‘ سونگھنا‘ چکھنا اور چھونا تو حیوانات میں بھی ہیں! انسان نے بھی اپنی حقیقت اگر یہی سمجھی تو اُس نے گویا اپنی اصل عظمت کو نہیں پہچانا۔ ادراک تو اصل میں اپنے سے باہر کی کسی شے کو محسوس کرنا ہے‘ جبکہ روشنی تو خود اپنا ظہور چاہتی ہے‘ اپنی تجلی چاہتی ہے۔ تو انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کے دو حصے ہیں‘ ایک اس کا یہ حیوانی وجود ہے‘ جو خاکیُ الاصل ہے‘ ظُلمانیُ الاصل ہے۔ اس کا میلان پستی اور گناہ کی طرف ہے۔ اور ایک اس کا روحانی وجود ہے جو نورانیُ الاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝۲۹﴾ (الحجر) ’’پس جب میں اسے (آدم علیہ السلام کو) بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں‘‘۔ یہاں روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔

تو یہ ہے ہمارا وہ نورانی عنصر جو ہر ایک انسان میں ہے۔ لیکن ع ’’گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی‘‘ کے مصداق سب کا نور برابر تو نہیں ہے۔ کسی کا محض ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہے۔ کسی کی اس نورانیت پر اس کے نفس کی ظلمانیت اس طرح چھا گئی ہے کہ وہ نور معدوم کے درجے

میں ہے۔ یعنی اس کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے‘ جبکہ کسی کا وہ نور اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی تمثیل یوں بیان کی ہے: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ﴾ (النور:۳۵) ’’(کسی کی فطرت کا نور اتنا صاف اور شفاف ہے کہ) بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہے‘ چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ روشنی پر روشنی ہے۔‘‘ یہ ہے وہ نور جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں موجود تھا۔ ابھی وحی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا‘ لیکن ان کے اندر اخلاقِ حسنہ کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ ایسے ہی تمام صدیقین اور انبیاء علیہم السلام کے اندر نورِ فطرت موجود ہوتا ہے۔ اب اس تناظر میں دیکھئے تو نبی اکرم ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ چونکہ بلند ترین ہے تو آپ ﷺ کی نورانیت بھی اتنی کامل ہے کہ اس نے خاکی وجود کی ظلمانیت کو بالکل معدوم کر دیا ہے۔ اس معنیٰ میں اگر کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نورِ مجسم ہیں تو غلط نہیں ہے۔

تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت صحیح ہیں۔ نبی اکرم ﷺ بیک وقت بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔ آپ ﷺ کی بشریت کا کون انکار کرے گا! آپ ﷺ کی ولادت ہوئی ہے جیسے کسی انسان کی ولادت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے بھی وہی دو ہاتھ اور دو پاؤں تھے۔ وہی انسانی خون آپ کے وجود میں بھی سرایت کیے ہوئے تھا اور گردش کر رہا تھا۔ طائف میں آپ ﷺ پر پتھراؤ ہوا ہے تو زخموں میں سے خون رسا ہے۔ میدانِ اُحد میں جب تلوار کا وار آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر لگا ہے تو خون کا فوارہ چھوٹا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے شادی کی ہے اور آپ ﷺ کے ہاں اولاد ہوئی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی نورانیت کی نفی ہرگز نہ کیجیے! آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی درحقیقت اِس دَور کا مادّہ پرستانہ فکر ہے جو میری آج کی بحث کا اصل موضوع ہے۔ ہم نے مادہ پرستانہ فکر اپنے ذہنوں پر اتنا مسلط کر لیا ہے کہ ہم روح کی حقیقت اور اس کے جداگانہ تشخص سے یا تو بالکلیہ منکر ہو گئے ہیں یا اس کا زبان پر ذکر لاتے ہوئے ہمیں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!

کہ روحانیت کی باتیں کرتے ہو؟ روح کی بات کرتے ہو؟ روح کو کوئی علیحدہ وجود مانتے ہو؟ تو یہ چیزیں ہمارے فکر اور نظریات کے دائرے سے اس طور سے باہر چلی گئی ہیں کہ اب ہم سمجھتے ہیں کہ انسان تو بس اسی حیوانی وجود کا نام ہے۔ ہم اپنے اس وجودِ حیوانی ہی کو اصل انسان سمجھے بیٹھے ہیں' اس لیے نورانیت کی نفی ہو رہی ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جو نورانی عنصر ہے' ایمان اور عملِ صالح سے اس کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس گناہوں اور نفسانیت سے یہ نور بجھتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم میں دو جگہ میدانِ حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس دن اہل ایمان کی شان یہ ہوگی کہ:

﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾﴾ (الحدید)

''اُس دن آپ مؤمن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (اُن سے کہا جائے گا) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔''

آگے منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ﴾ (آیت ۱۳)

''اُس دن منافق مردوں اور عورتوں کا حال (جو دنیا میں چراغ گل کر کے جائیں گے) یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے استدعا کریں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو (ذرا ہمیں مہلت دو)' تا کہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کریں۔ کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (اگر ہو سکتا ہے تو دنیا میں واپس جاؤ) اور اس نور کی تحصیل کر کے آؤ۔''

سورۃ التحریم میں ہے:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۸﴾﴾

''اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ: اے ہمارے ربّ! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس نور کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے دن کسی کا نور بس اتنا ہوگا کہ اس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی' اور کسی کا نور اِس قدر ہوگا کہ اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچے گی۔ یعنی اُس روز کسی کا نور بہت تھوڑا ہوگا کہ بس اس سے قدموں کے آگے آگے روشنی ہوگی۔ اور قیامت کے دن یہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا جس کو نصیب ہو گیا۔ اس لیے کہ اندھیرے میں ایک ٹارچ بھی بہت غنیمت ہوتی ہے جس سے آپ بالآخر منزلِ مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ جبکہ کسی کا نور اُس روز بہت زیادہ ہوگا جس سے ہر سو چراغاں ہو جائے گا۔ یہ حفظِ مراتب ہے۔ اس تناظر میں دیکھئے تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا نور کس قدر ہوگا! ان باتوں کو ذہن میں رکھیے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیک وقت ''بشر'' بھی ہیں اور ''نور'' بھی ہیں۔ اور یہی معاملہ ہم سب کا بھی ہے۔ ہمارا ایک روحانی وجود ہے جو نوری الاصل ہے اور ایک مادی وجود ہے جو خاکی الاصل ہے اور ہماری شخصیتوں میں ان دونوں کا امتزاج ہے۔ کسی کی ظلمانیت اس نور پر ایسے غالب آ گئی ہے کہ نور معدوم ہو گیا ہے اور کسی کی ظلمانیت پر اس کی نورانیت کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ اس کی ظلمانیت کافور ہو گئی ہے۔

اسی حقیقت کو حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں اس طرح سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ)) قَالُوْا: وَاِيَّاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((وَاِيَّايَ اِلَّا اَنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا

يَاْمُرُنِیْ اِلاَّ بِخَیْرٍ)) (۱)

’’تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ہمراہ ایک ساتھی شیطان نہ سونپ دیا گیا ہو‘‘۔ صحابہ کرامؓ نے (بڑی ہمت کر کے) دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ ﷺ بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہاں میں بھی‘ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی تو میں نے اسے مسلمان بنا لیا۔ اب وہ مجھے سوائے بھلائی کے کوئی اور مشورہ نہیں دیتا۔‘‘

یہ رسول اللہ ﷺ کا بات کو سمجھانے کا ایک انداز تھا۔ بہرحال وہ نفس تھا تو سہی رسول اللہ ﷺ کے اندر بھی۔ آپ ﷺ کا بطنِ مبارک بھی کھانے کو مانگتا تھا۔ بھوک کا احساس محمد ﷺ کو بھی ہوتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ پر بھی نقاہت طاری ہوتی تھی۔ طائف میں پتھراؤ کی وجہ سے جب بہت زیادہ خون بہا تو آپ ﷺ پر نقاہت طاری ہوئی اور آپ ﷺ بیٹھ گئے۔ اسی طرح اُحد میں بھی بہت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے آپ ﷺ پر نقاہت طاری ہوئی اور آپ ﷺ بے ہوش ہو گئے۔ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے‘ اس لیے کہ انسانی عواطف و میلانات اور احساسات و جذبات آپ ﷺ کی شخصیت میں بتمام و کمال موجود تھے۔ لیکن ان چیزوں کی وجہ سے کبھی آپ ﷺ سے (معاذ اللہ) خدا کی معصیت کا صدور ممکن نہیں ہوا۔ آپ ﷺ کو تمام بشری تقاضوں اور آثارِ طبعی پر اس قدر قابو تھا کہ کوئی بھی چیز آپ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرا سکی۔

مسلمانوں میں اَوتار کا تصور

گزشتہ صفحات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ ہندوؤں کے ہاں نو اَوتار تھے‘ ایک دسواں اَوتار اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں نے اُن میں شامل کر لیا ہے۔ اب اس بات کی ذرا تفصیل جان لیجیے! دراصل شیعیت کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ہمارے ہاں جو

(۱) صحيح مسلم' كتاب صفة القيامة والجنة والنار' باب تحريس الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس وان مع كل انسان قرينا۔

معروف شیعہ ہیں وہ ’’اثنا عشری‘‘ ہیں‘ یعنی پہلے بارہ اماموں کے ماننے والے۔ ان کے خیال میں بارہویں امام غائب ہو گئے جو امامِ منتظَر کہلاتے ہیں اور وہ اُن کے انتظار میں ہیں کہ دوبارہ آئیں گے۔ چھٹے امام پر ایک شاخ علیحدہ ہو گئی جو ’’شش امامیہ‘‘ کہلاتے ہیں۔ یعنی پہلے چھ امام تو ’’اثنا عشری‘‘ اور ’’شش امامیہ‘‘ کے مابین مشترک ہیں‘ لیکن اسماعیل‘ جو امام جعفر صادقؒ کے بڑے صاحبزادے تھے‘ ان سے اِن شش امامیہ والوں کی شاخ الگ ہو گئی۔ شش امامیہ والوں کی بھی آگے چل کر دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک شاخ وہ ہے جو ہمارے ہاں ’’بوہرے‘‘ کہلاتے ہیں۔ ان کے غالباً ۳۲ ویں امام غائب ہو گئے۔ طاہر سیف الدین‘ جن کا انتقال ہو گیا‘ اور برہان الدین جو بمبئی میں رہتے ہیں‘ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ یہ امام نہیں کہلاتے بلکہ داعی کہلاتے ہیں۔ شش امامیہ کی دوسری شاخ ’’اسماعیلی‘‘ ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق ان کے امام غائب نہیں ہوئے‘ بلکہ امامت کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ اِس وقت پرنس کریم آغا خان ان کے امامِ حاضر ہیں۔ یہ امام کو معصوم مانتے ہیں۔

پیر شمس الدین سبزواری (۱) اور دیگر اسماعیلی مبلغین کے ذریعے اسماعیلیت کی دعوت جب ہندوستان میں دی گئی تو ان مبلغین نے دعوت و تبلیغ کے لیے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ چونکہ ہندوؤں کو مسلمان بنانا آسان کام نہیں‘ لہٰذا ان کے عقیدوں کے ساتھ ہی ذرا اپنے عقیدے کو جوڑ دیں تو بات بن جائے گی۔ ہندو نو اَوتار مانتے تھے‘ انہوں نے یہ کہا کہ نو اَوتار تمہارے ہیں اور دسواں اَوتار ایک اور آیا ہے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس مذہب میں ’’دشم اَوتار‘‘ یعنی دسواں اَوتار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مانا جاتا ہے۔ اَوتار یا Incarnation کا یہ عقیدہ باضابطہ طور پر ان کے عقائد میں شامل ہے۔

دوسرا کام ان مبلغین نے یہ کیا کہ ہندوستان میں نئے ایمان لانے والوں پر سے شریعت ساقط کر دی۔ ظاہر بات ہے اگر کسی کو اسلام یا دین کی تعلیم دی جائے اور اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ پانچ نمازیں بھی پڑھنی پڑیں گی‘ تیس روزے بھی رکھنے پڑیں گے‘ تو وہ اسلام

(۱) ان کا مزار ملتان میں ہے جو خواہ مخواہ شمس تبریز کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ حالانکہ شمس تبریز کا ملتان میں آنے کا کوئی سوال اور امکان ہی نہیں ہے۔

میں داخل ہونے سے پہلے دس دفعہ خوب سوچے گا۔ لیکن اگر اسے یہ کہا جائے کہ کوئی شریعت تم پر لاگو نہیں ہوگی' بس تم کلمہ پڑھو' تو اس کے لیے اب کام آسان ہو جائے گا۔ جیسے سینٹ پال نے کہا تھا کہ بس حضرت مسیح (علیہ السلام) کو مان لو تو تمہارے گناہوں کی طرف سے وہ پیشگی کفارہ ہو جائیں گے' تمہارے اوپر شریعت کا بھی بوجھ نہیں ہوگا اور حلال وحرام کی قید بھی نہیں ہوگی' چاہے خنزیر کھاؤ اور شراب پیو۔ چنانچہ ان کے ہاں پہلے سے جو مشرکانہ عقائد تھے ان پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنی تثلیث بنالی اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اس عقیدے سے اپنے مذہب کو جوڑ دیا۔ تو اس طرح سے سینٹ پال والی عیسائیت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بعینہٖ یہی کام ہندوستان میں اسماعیلی داعیوں نے کیا کہ شریعت ساقط قرار دے دی۔ لہٰذا ہمارے آغاخانیوں کے ہاں نماز روزہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ ان کی مسجدیں نہیں ہوتیں' محض جماعت خانے ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت کلبوں اور چوپال کی ہے جہاں وہ آ کر بیٹھتے ہیں اور ساتھ مل کر کھانا وغیرہ کھاتے ہیں۔ جماعت خانہ ان کی سوشل لائف کا ایک مرکز ہے۔ باقی یہ کہ شریعت اُن سے ساقط ہے۔ البتہ ہمارے شمالی علاقے ہنزہ اور چترال میں جو اسماعیلی آباد ہیں' ان کے ہاں شریعت موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ local converts نہیں ہیں' بلکہ وہ ایران سے آئے تھے۔ جبکہ بمبئی اور کاٹھیاواڑ وغیرہ کے علاقے میں مقامی لوگوں نے جو اسماعیلیت قبول کی ہے اس میں ایک تو شریعت ساقط ہے اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے دسویں اَوتار ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' ہندوستان میں نو اَوتار پہلے سے پوجے جا رہے تھے' دسواں اَوتار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منوا کر اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

شرک فی الصفات

الحمد للہ ہم نے اقسامِ شرک کے حوالے سے شرک کی پہلی قسم ''شرک فی الذات'' کا کسی حد تک فہم حاصل کر لیا ہے۔ اب ہم اللہ کی توفیق سے شرک کی دوسری قسم ''شرک فی الصفات'' کی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ شرک فی الصفات کے بارے میں ابتدائی طور پر یہ جان لیجیے کہ یہ مسئلہ ذرا باریک اور علمی نوعیت کا ہے اور اس میں پاؤں پھسل جانے کا بڑی آسانی سے احتمال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان کی تنگ دامانی کے باعث صفات (Adjectives and attributes) کے طور پر جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ خالق اور مخلوق کے مابین مشترک ہیں۔ یعنی وہی الفاظ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہی مخلوق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کائنات بھی موجود' خدا بھی موجود' میں بھی موجود' آپ بھی موجود۔ اس طرح ایک وصف ''وجود'' مشترک ہو گیا اللہ تعالیٰ میں' اس کائنات میں' مجھ میں اور آپ میں۔ اسی طرح صفت ''حیات'' مشترک ہے اللہ اور مخلوق کے مابین۔ اللہ تعالیٰ بھی زندہ' ہم بھی زندہ' یہ چوپائے وغیرہ بھی زندہ۔ لفظ ''علم'' کا استعمال اللہ کے لیے بھی ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اور بندوں کے لیے بھی' بلکہ انسانوں میں ''عَلّامہ'' بھی ہوتے ہیں جو صفتِ علم کا مبالغے کا صیغہ ہے۔ لفظ ''ارادہ'' بندوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ ''میرا یہ ارادہ ہے'' اور اللہ کے لیے بھی کہ ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾﴾ (یٰسٓ)۔ اسی طرح لفظ ''مشیت'' مشترک ہے اللہ اور مخلوق کے مابین۔ جیسے کسی صحابیٔ رسول ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ'' (جو اللہ کی مشیت اور جو آپ ﷺ کی مشیت) تو نبی اکرم ﷺ نے اُن کو سختی سے ٹوک دیا' اس لیے کہ اس سے شرک کا شائبہ جنم لے سکتا تھا' حالانکہ ان صحابیٔ رسول ﷺ کی نیت میں' معاذ اللہ' کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ تو صفات کے لیے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب مشترک ہیں خالق اور

مخلوق کے مابین۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی مستعمل ہیں اور مخلوقات کے لیے بھی' اور اسی سے فساد اور غلطی کا سارا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ جب اِن الفاظ کا استعمال اللہ کے لیے ہوتا ہے تو ان کا مفہوم بالکل مختلف ہے اُس مفہوم سے کہ جس مفہوم میں ان الفاظ کا استعمال مخلوقات کے لیے ہوتا ہے۔ لفظ مشترک ہے جبکہ مفہوم جدا ہے۔

شرک فی الصفات سے بچاؤ کا فارمولا

اب یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کی صفات الفاظ مشترک ہونے کے باوجود مفہوم و معنی میں کس طرح جدا ہیں۔ تین چیزیں اگر مدّنظر نہ رہیں اور ذہن میں مستحضر نہ رہیں تو شرک کا بلاارادہ اور بلاشعور احتمال پیدا ہو جائے گا۔ پہلی چیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی قدیم ہے اور اس کی صفات بھی قدیم ہیں' جبکہ ماسوی اللہ (جملہ مخلوقات) کا وجود بھی حادث ہے اور صفات بھی حادث ہیں۔ جو بڑے سے بڑے مشرک گزرے ہیں خدا کو تو انہوں نے بھی قدیم مانا ہے۔ ''تعدّدِ قدماء'' کا نظریہ رکھنے والوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ بھی قدیم' روح بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم۔ کچھ لوگوں نے ذرا رعایت کرتے ہوئے دو ہستیوں کو قدیم مانا ہے کہ خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم' جبکہ توحید یہ ہے کہ قدیم ہستی صرف اللہ کی ہے' باقی سب کو حدوث لاحق ہے کہ پہلے نہیں تھے' پھر ہو گئے۔

دوسری چیز یہ کہ اللہ کا وجود بھی ذاتی ہے اور صفات بھی ذاتی ہیں' جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی عطائی ہے اور صفات بھی عطائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو از خود ہے' خود بخود ہے۔ کوئی اور تو اسے وجود دینے والا نہیں' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ اسی طرح اس کی صفات بھی ذاتی ہیں' کسی اور کی عطا کردہ نہیں' اس کو علم کسی اور نے نہیں دیا' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ جبکہ جملہ مخلوقات کا وجود بھی عطائی ہے' اللہ نے ہی سب کو وجود عطا کیا ہے۔ بقول شاعر:

لائی حیات آئے ' قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے ' نہ اپنی خوشی چلے

تو یہ قضا اور حیات تو بس ارادۂ خداوندی ہے' فیصلۂ خداوندی ہے' امرِ خداوندی ہے۔ اُس نے چاہا تو ہم ہو گئے۔ اسی طرح جملہ مخلوقات کی صفات بھی عطائی ہیں' ذاتی نہیں ہیں' اللہ

نے عطا کی ہیں۔

تیسری چیز یہ کہ اللہ کی ذات بھی مطلق ہے اور صفات بھی مطلق ہیں' جبکہ ماسوی اللہ (جملہ مخلوقات) کا وجود بھی محدود ہے اور صفات بھی محدود ہیں۔ ''مطلق'' عربی زبان میں ''ط' ل' ق'' مادے سے ہے جس کا مطلب ہے آزادی' بے قید ہونا' لامتناہی ہونا' حدود اور نہایت سے مبرّا ہونا۔ ''طلاق'' کا مطلب یہی ہے کہ عورت کو نکاح کے بندھن سے آزاد کر دیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا وجود اور صفات مطلق' لامتناہی' حدود و قیود اور انتہا سے مبرا ہیں۔ انگریزی میں اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے: ''The Absolute Being''۔ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان کے لیے ایک ہی لفظ ''کُل'' کے دامن میں پناہ لیتے ہیں کہ: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝﴾ ''وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے''۔ اور: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ ''وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اس حوالے سے جان لیجیے کہ جب بھی کوئی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور وصف یا صفت بولا جائے تو مذکورہ بالا تین تصورات ذہن میں مستحضر رہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ کی وہ صفت یا وصف قدیم ہے' اس میں حدوث کا کوئی شائبہ نہیں۔ (۲) وہ ذاتی ہے' کسی کا عطا کردہ نہیں۔ اور (۳) وہ مطلق اور لامتناہی ہے' اس میں کہیں کوئی حدّ و نہایت نہیں۔ اس کے بالکل برعکس جب وہی لفظ ہم مخلوقات میں سے کسی کے لیے بطور صفت یا وصف بولیں گے تو وہاں یہ تین تصورات ملحوظ رہیں گے کہ جیسے وہ چیز خود حادث ہے ویسے ہی اس کی وہ صفت بھی حادث ہے' جیسے اس کا وجود عطائی ویسے ہی اس کی صفت بھی عطائی ہے اور جیسے اس کا وجود محدود ہے ویسے ہی اس کی صفت بھی محدود ہے۔ تو یہ تینوں تصورات اگر ہر وقت مدّنظر رہیں تو صفات کے معاملے میں آدمی شرک میں ملوث نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی میں بھی ٹھوکر کھا گئے تو ''شرک فی الصفات'' کا راستہ کھل جائے گا۔ یہ الجبرے کے فارمولے کی طرح بالکل واضح بات ہے۔ اس کو سمجھ لیا جائے تو بڑے بڑے مسائل اور عقدے حل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ گویا وہ کلید ہے کہ جس سے ہمارے ہاں عقائد کی بحثوں کے جو بڑے بڑے تالے پڑے ہوئے ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے۔

دورِ جدید کا سب سے بڑا شرک

اب جو اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے پہلے اسے سمجھ لیا جائے‘ جس کے بارے میں مَیں اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس سے بالکل بری ہوں۔ اللہ ہی جس کو بچالے وہ بچ جائے گا‘ ورنہ اللہ کی توفیق کے بغیر اس سے بچنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ شرک کیا ہے؟ وہ ’’مادّہ پرستی کا شرک‘‘ ہے۔ اصل میں ایک نظریہ‘ ایک خیال اور ایک مغالطہ دنیا میں رہا تو ہمیشہ سے ہے‘ لیکن اِس دَور میں آ کر اس نے ایک فلسفہ‘ فکرِ انسانی کے لیے ایک بہت بڑے محور اور مرکز کی حیثیت اختیار کر لی ہے‘ اور وہ یہ ہے کہ مادہ کی صفات (Properties of the matter) مستقل ہیں‘ دائم ہیں‘ غیر متبدل (immutable) ہیں‘ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی‘ یہ صفات مادے سے منفک نہیں ہو سکتیں اور قوانین طبیعی (Laws of the Nature) کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ جب سے سائنس کا دَور دورہ‘ شُہرہ اور غلغلہ ہوا ہے اور جب سے ذہنوں پر اس کی چھاپ بہت گہری ہوگئی ہے اور سائنسی اکتشافات نے انسان کو مبہوت اور مرعوب کر دیا ہے تب سے یہ فکر ہمارے ذہنوں میں پیوست ہوگیا ہے کہ مادے کی صفات مستقل ہیں‘ دائم ہیں‘ ہمیشہ بروئے کار آتی ہیں‘ کوئی صورت نہیں ہے کہ مادے سے اس کی صفت منفک ہو جائے‘ بلکہ وہ اپنی جگہ مستقل بالذات ہے۔ گویا ہم نے آج مادے کو اُس مقام پر بٹھا دیا ہے جہاں اصلاً اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ صفات تو اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائم ہیں‘ قانون تو اس کا ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے بچے کو وصیت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَۃِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ ’’فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں‘‘۔ جیسے حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ ’’اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو! یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔‘‘

اصل حقیقت یہ ہے کہ آگ میں جلانے کی تاثیر ہے‘ لیکن یہ اس کی ذاتی نہیں ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ ہے اور اُسی وقت بروئے کار آئے گی جب اللہ چاہے گا۔ آگ

کو جلانے کی صفت ودیعت کرنے کے بعد‘ معاذ اللہ‘ اللہ کے ہاتھ بندھ نہیں گئے کہ مَیں تو آگ میں جلانے کی صفت پیدا کر چکا‘ بدبختوں نے ابراہیم علیہ السلام کو اٹھا کر آگ میں پھینک دیا ہے تو اب میں کیا کروں! معاذ اللہ۔ آگ کا وصف ذاتی اور مستقل نہیں‘ بلکہ اللہ کے اِذن کے تابع ہے۔ آگ اُسی وقت جلائے گی جب اللہ کا اِذن ہوگا‘ اگر نہیں ہوگا تو نہیں جلائے گی۔ لٰہذا تمام صفاتِ مادہ تابع ہیں مشیتِ خداوندی کے‘ یہ مستقل بالذات نہیں ہیں۔ نیوٹونین فزکس یعنی جو فزکس کا ابتدائی دَور تھا‘ اس میں بڑا اِذعان اور بڑا یقین تھا کہ جو قوانین ہم نے دریافت کر لیے ہیں یہ حتمی ہیں‘ ان میں کسی تبدیلی کا امکان ہی نہیں ہے۔

"We have discovered the final truth."

اور ’’قانون بقائے مادہ‘‘ کی رو سے مادہ لازوال اور غیر فانی ہے:

(Matter is indestructible.)

اور matter اور energy دو جدا کیٹیگریز ہیں۔ یہ نیوٹن کی فزکس کے مبادیات تھے۔ ان کا جب ہمارے عقائد‘ مذہبی فکر اور ایمانی نظریات کے ساتھ تصادم ہوا تو اس کا پہلا مظہر یہ سامنے آیا کہ اب معجزات کی کیا تعبیر و تاویل کی جائے! مغربی فکر اور استعمار کا یہ ریلا اتنا شدید تھا کہ بیچارے سر سید احمد خان جیسا مخلص مسلمان بھی ثابت قدم نہ رہ سکا اور اس سیلاب کی رو میں بہہ گیا۔

اُس وقت ایک طرف مغربی تہذیب‘ مغربی استعمار اور مغربی قوت تھی‘ ان کی فوجیں آ رہی تھیں۔ اور دوسری طرف اُن کا فکر آ رہا تھا‘ سائنس بڑے زور و شور کے ساتھ آ رہی تھی تو اس سیلاب کے آگے کھڑے رہنا آسان نہیں تھا‘ لٰہذا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے اور انہوں نے قرآنی تعلیمات کو مغربی فکر کے سانچے میں ڈھالنے اور اس کے موافق بنانے کی کوشش کی۔ اُن کے لیے یہ مشکل پیدا ہوئی کہ پانی تو اپنی سطح برقرار رکھتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عصاءِ موسیٰ کی ضرب سے سمندر کا پانی پھٹ گیا؟ سر سید کے فکر کی ترجمانی کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ قرآن میں ایسی ہلکی بات آ گئی‘ اب ہم دنیا کو کیا مُنہ دکھائیں؟ ہمارے لیے تو اِس سائنسی دَور میں لوگوں سے آنکھیں چار کرنا ممکن نہیں رہا۔ لٰہذا اس کی کوئی ایسی تاویل اور تعبیر کرو کہ مذہب اپنی جگہ قائم رہ جائے اور سائنس اپنی جگہ قائم رہ

جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اصل میں یہ تو مدّ و جزر کی بات تھی جسے مولویوں نے سمجھا نہیں اور اسے خواہ مخواہ ایک عجوبہ اور معجزہ قرار دے دیا اور ایک افسانہ بنا لیا۔ جوار بھاٹا سمندر میں آتا رہتا ہے۔ کبھی سمندر recede کر جاتا ہے، پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور خشکی نکل آتی ہے، کبھی سمندر چڑھاؤ پر آتا ہے تو پانی ہی پانی ہو جاتا ہے۔ اصل میں سمندر اُس وقت جزر پر تھا جبکہ موسٰی علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکل گئے، اور جب فرعون اپنے لشکر سمیت گزرنے لگا تو اُس وقت سمندر مدّ پر آ گیا، لہٰذا فرعون لشکر سمیت ڈوب گیا۔

یہ تأویل درحقیقت سرسید کی اس سوچ کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ سائنسی فکر، اس کے رعب و دبدبے اور جاہ وجلال کے مقابلے میں اپنے تئیں اسلام کا دفاع کر رہے تھے۔ اس حوالے سے سرسید ہمدردی کے مستحق ہیں۔ یہ درحقیقت اس مغربی فکر کا پہلا حملہ تھا جو ہم پر ہوا، جس کے نتیجے میں معجزات کا انکار ہوا اور ہر چیز کی تأویل کرنے کی کوشش کی گئی۔ انسان کے ذہن میں جب کوئی فکر راسخ ہو جاتا ہے تو بڑی بڑی حقیقتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، وہ گویا اندھا ہو جاتا ہے اور راستے کے بڑے بڑے پتھر اسے نظر نہیں آتے۔ اور ایسا بڑے بڑوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خان پر جب یہ فکر مسلط ہو گیا تو انہیں قرآن میں یہ الفاظ نظر نہیں آئے: ﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝٦٣﴾ (الشُّعراء) ''پس سمندر پھٹ گیا تو اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا''۔ اِنْفَلَقَ يَنْفَلِقُ کا مطلب ہے پھٹ جانا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں ''فَالِقُ الْاِصْبَاحِ'' (رات کی تاریکی کا پردہ پھاڑنے والا) اور ''فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى'' (دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا) کے الفاظ آئے ہیں۔ تو یہاں فَانْفَلَقَ کا ترجمہ مدّ و جزر کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت کے اگلے الفاظ: ﴿فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝٦٣﴾ ''تو (سمندر کا) ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔'' سے مدّ و جزر مراد ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں، اس کی اس فطری مظہر (مدّ و جزر) کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جب کوئی فکر کسی سبب سے انسان کے ذہن کے اوپر اس طرح مستولی ہو جاتا ہے تو بڑی بڑی حقیقتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور

بعینہٖ یہی معاملہ سرسید احمد خان کے ساتھ پیش آیا۔ اور صرف انہی کے ساتھ نہیں، اور بھی کئی بڑے بڑوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔

میں یہاں ایک مثال مولانا ثناء اللہ امرتسری کی دیتا ہوں۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے، پکے اہلحدیث تھے، اسلامی روایات، قرآن مجید اور حدیث کو تھامنے والے تھے۔ لیکن وہ دَور ہی ایسا تھا کہ ایک جگہ اُن کے قدم بھی پھسل گئے۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ نقل ہوا ہے کہ ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ﴾ ''اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے!'' اللہ تعالیٰ نے فوراً سوال کیا: ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ﴾ ''کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟'' اس پر ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: ﴿بَلٰى وَلٰـكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ﴾ ''کیوں نہیں (میں یقیناً ایمان رکھتا ہوں) لیکن ذرا مزید اطمینانِ قلبی درکار ہے۔'' اس کے بعد حکم دیا گیا: ﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''تو چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو (مانوس کر لو)۔'' ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ﴾ (آیت ۲۶۰) ''پھر (انہیں ذبح کر کے) اُن کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو، پھر اُن کو پکارو، وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔'' یہاں ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''تو انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لو'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ پرندے آپ کو پہچان لیں جن کو آپ نے ٹکڑوں میں بانٹا ہے اور آپ اُن کو پہچان لیں کہ یہ وہی پرندے، کبوتر یا تیتر وغیرہ ہیں جن کے آپ نے ٹکڑے کیے ہیں، کوئی اور نہیں ہیں جو بلانے پر آ گئے ہوں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ اس سائنسی سوچ کے دَور میں یہ بات کیسے کہیں۔ لہٰذا انہوں نے تأویل کی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چار پورے پورے پرندے مختلف پہاڑوں پر رکھو اور انہیں پکارو تو وہ آ جائیں گے۔ اب یہ مشاہدہ تو ہر تیتر باز اور بٹیر باز کو ہوتا ہے کہ وہ خود سے مانوس تیتر یا بٹیر کو اپنے پاس بلاتا ہے، سیٹی بجاتا ہے تو وہ آ جاتا ہے۔ اگر اس سے یہی مراد ہے تو اِس قدر اہتمام کے ساتھ اور احیاءِ موتٰی پر اطمینانِ قلب حاصل کرنے کی دعا کے جواب میں یہ بات کیوں کہی

گئی؟ جس میں ابتداءً ذرا ڈانٹ کا انداز بھی آ گیا کہ کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا کہ پروردگار! میں مانتا تو ہوں لیکن ذرا اطمینانِ قلبی درکار ہے۔ جب مولانا ثناءاللہ امرتسری سے کہا گیا کہ آپ نے اس آیت کی یہ تأویل کیوں کر دی، تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ میں کیا کروں، مجھے دوسروں کے سامنے بات پیش کرنی ہے۔ تو یہ ہے اصل بات کہ جس دَور کے لوگوں سے خطاب کرنا ہو اُن کے مسلّمات کا کچھ تو لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

تو پہلی بات یہ جان لیجیے کہ اگر آپ نے کسی کے کسی وصف کو دائم اور مستقل بالذات مان لیا تو آپ شرک فی الصفات کے مرتکب ہو گئے۔ اس لیے کہ قائم و دائم، مستقل بالذات اور مطلق اوصاف تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہیں، کسی اور کے اندر کوئی صفت، تأثیر یا وصف مستقل نہیں، مطلق نہیں، ہمیشہ سے نہیں اور ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ ہر شے اور ہر ہستی کے اوصاف تابع ہیں اذنِ خداوندی کے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اُن کا ظہور ہو گا، ورنہ کسی صفت کی کوئی تأثیر ظاہر نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ بالا سائنسی طرزِ فکر کی وجہ سے ذہنوں میں جو سوچ پختہ اور راسخ ہوئی ہے اسے ''مادہ پرستی کا شرک'' کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا سارا توکل اور انحصار مادی اسباب و وسائل پر ہے، اگر یہ حاصل ہیں تو دلجمعی بھی حاصل ہے، یہ نہیں ہیں تو دل اُڑا ہوا ہے۔ اللہ کی قدرت پر اتنا یقین نہیں ہے جتنا کہ مادی وسائل کے نتائج پر یقین ہے۔ نتیجتاً سارا بھروسہ اور توکل ذاتِ خداوندی سے ہٹ کر مادی اسباب و وسائل کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔ حکمتِ قرآنی کی جڑ توحید ہے اور ''تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا'' کے مصداق توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کو سمجھنا پڑے گا۔ رات کو دن کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے اور دن کی حقیقت رات کے حوالے سے روشن ہوتی ہے۔ چنانچہ توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کو سمجھنا ضروری ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں توحید کو مثبت انداز میں اور شرک کو منفی انداز میں خوب عیاں کیا گیا ہے۔ ان دونوں سورتوں کو میں ''حکمتِ قرآنی کے عظیم ترین

خزانے'' قرار دیتا ہوں۔ سورۂ بنی اسرائیل کے بالکل آغاز میں فرمایا گیا:

﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴿٢﴾﴾

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا فرمائی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا (رہنمائی قرار دیا) کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنا لینا۔''

''وَكِيْلٌ'' کا مادہ ''و ك ل'' ہے اور مطلب ہے جس پر توکل اور بھروسہ ہو، جس سے اُمیدیں وابستہ ہوں، جس کو کارساز سمجھا گیا ہو، جس کو کسی بھی مسئلے میں اپنی مشکل کا حل سمجھا جا رہا ہو۔ سورۃ المؤمن میں مؤمنِ آلِ فرعون کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٤٤﴾﴾ ''اور میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے''۔ ''توحید فی التوکل'' یہی تو ہے کہ سارا بھروسہ، دار و مدار اور انحصار اسباب و وسائل کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ اسباب و وسائل کی نفی قطعاً نہیں ہے، لیکن یہ کہ کوئی بھروسہ اُن پر قطعاً نہ ہو۔ سورۃ الانفال میں فرمایا گیا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ......﴾ (آیت ٦٠) ''اور اپنی امکانی حد تک ان (کفار) کے مقابلے کے لیے طاقت تیار رکھو۔'' یعنی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے کے بجائے جتنے بھی اسباب و وسائل فراہم کر سکتے ہو کرو، لیکن تمہارا توکل ان اسباب و وسائل پر نہ ہو۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ اسباب سے کچھ نہیں ہو گا، بلکہ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور اللہ بغیر اسباب کے بھی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے، وہ اسباب کا محتاج قطعاً نہیں، اور اللہ تعالیٰ اسباب کے ہوتے ہوئے الٹا نتیجہ بھی برآمد کر سکتا ہے، وہ اسباب کا پابند نہیں۔

ان دونوں میں سے کوئی پہلو بھی اگر آپ کے ذہن میں ہے تو آپ ''شرک فی التوکل'' کے اندر ملوث ہو گئے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ نے کہیں جانا ہے اور آپ کے پاس کار یا کوئی اور سواری درست حالت میں موجود ہے، آپ نے اس کے لیے پٹرول کا انتظام بھی کر لیا ہے اور آپ نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ صبح اُٹھ کر لازماً اپنی منزلِ

مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ اب آپ کے روانہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور آپ یہ بھول گئے ہیں کہ ان اسباب کے اوپر ایک مُسبّب الاسباب ہستی بھی ہے اور سارے وسائل کے جمع ہونے کے باوجود بھی آپ اُس کے اِذن کے بغیر ہل نہیں سکتے تو آپ گویا مادہ پرستی کے شرک میں مبتلا ہو گئے' شرک فی التوکل میں ملوث ہو گئے۔ یہ اصل میں محجوبیت ہے کہ آپ اسباب کے پردے میں محجوب ہو گئے' اسباب کا یقین آپ کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔ آپ کے ذہن میں اسباب پر توکل پیدا ہو گیا' آپ نے اپنے دل کے سنگھاسن پر مادی اسباب و وسائل کو بٹھا دیا' اللہ سے نگاہیں محجوب رہ گئیں۔ جیسے اقبال نے کہا:

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ہمارا طرزِ عمل ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ جب بھی کسی کام کا ارادہ کریں تو مقدور بھر اسباب و وسائل بروئے کار لانے کے بعد زبان پر الفاظ ہوں ''اِن شاء اللہ'' اور دل میں یہ پختہ یقین ہو کہ تمام اسباب و وسائل اذنِ خداوندی کے محتاج ہیں اور نتیجہ وہی نکلے گا جو اللہ چاہے گا۔ اسباب و وسائل پر یقین کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ''میں کل یہ کام ضرور کروں گا''۔ اگر کوئی عامی انسان یہ کہہ رہا ہو تو اس کی فوری پکڑ نہیں ہو گی' اس لیے کہ اس کی اپنی ذہنی سطح ہے' اسے ابھی وہ قلبی ترفّع حاصل نہیں ہوا' وہ تو اسباب و وسائل ہی کے چکر میں ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر نبی کریم ﷺ کی گرفت فرمائی۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ سے کچھ سوالات کیے کہ ذرا بتائیے اصحابِ کہف کون تھے' روح کی حقیقت کیا ہے' ذوالقرنین کون تھا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ سوچ کر کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آتے ہی رہتے ہیں' ان سے پوچھ لوں گا' کہہ دیا: ''میں کل جواب دے دوں گا'' اور ''اِن شاء اللہ'' نہ کہا' تو آپ ﷺ کی گرفت ہو گئی۔ اس لیے کہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ'' کہ بہت سی چیزیں جو اَبرار کے لیے نیکیاں ہو سکتی ہیں وہی مقربین کے لیے قابل گرفت ہو سکتی ہیں' ان کے مرتبے سے فروتر ہو سکتی ہیں۔ اب حضرت جبرائیلؑ نہیں آ رہے اور لوگ تالیاں پیٹ

رہے ہیں کہ محمد ﷺ! کیا جوابات ہیں اِن سوالوں کے؟ نبی اکرم ﷺ خاموش ہیں۔ آپ ذرا سوچیے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے لیے کس قدر تشویش ناک اور نازک صورت حال ہو گی۔ لیکن حکمتِ خداوندی یہی تھی کہ آپ ﷺ کی گرفت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝٢٣ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(الکھف: ٢٣' ٢٤)

''اور (اے نبی ﷺ!) کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا' مگر (اس استثناء کے ساتھ کہ) اگر اللہ نے چاہا۔''

اس کے بعد سورۃ الکھف میں اُن سوالات کے جوابات نازل فرمائے گئے۔ تو یہ ہے اصل میں ''توحید فی التوکل'' کہ کسی شے سے کچھ نہیں ہو سکتا' جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔

''شرک فی التوکل'' یا مادہ پرستی کی سورۃ الکھف کے پانچویں رکوع میں اس شرک کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت ہوئی ہے۔ اس میں دو اشخاص کا مکالمہ بڑی تفصیل سے نقل ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تمثیلی پیرایہ ہو۔ ان دو اشخاص میں سے ایک درویشِ خدا مست تھا۔ اس کے پاس دُنیوی اسباب و وسائل اور مال و دولت نہیں تھی' لیکن اللہ پر اس کا کامل یقین اور توکل تھا۔ وہ معرفتِ خداوندی اور اللہ پر ایمان سے سرشار تھا' جبکہ دوسرا سرمایہ دارِ مال مست تھا۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝٣٢ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝٣٣ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) ان کے سامنے مثال بیان کیجیے دو اشخاص کی' ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور اُن کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ (یعنی پھل کے ساتھ ساتھ اجناس بھی پیدا ہو رہی تھیں) دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بارآور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی اور ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی (یعنی آب

پاشی کا نظام بھی موجود تھا اور باغ کبھی سوکھا نہیں تھا)۔مزید یہ کہ اس کا ثمر بھی تھا''۔

[اس سے یہ مراد بھی لی گئی ہے کہ وہ صاحب اولاد بھی تھا اور یہ بھی کہ باغ پھلوں سے لدا پھندا تھا]

﴿ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ ﴾

''پس اس نے اپنے ساتھی (درویشِ خدا مست) سے کہا جو کہ اُس سے ہم کلام تھا (خیر اور بھلائی کی کوئی بات کر رہا تھا' کچھ خوفِ خدا دلا رہا تھا) کہ میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں''۔

یعنی اس کا دُنیوی مال و متاع اور اسباب و وسائل پر مکمل بھروسہ ہو گیا۔آج کل کے زمانے میں یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے پاس دو بڑی بڑی ملیں(mills) ہوں اور اس نے ایک بڑا فارم بھی لگایا ہوا ہو۔آب پاشی کے لیے بھی اس کا اپنا نظام ہو اور بجلی کے لیے واپڈا پر انحصار کرنے کے بجائے اس نے اپنا ہی دیوقامت جنریٹر لگا لیا ہو اور دو سال تک کے لیے ڈیزل بھی مہیا کر رکھا ہو' تو اُس شخص کے دل میں جو خناس پیدا ہو گا وہ اُس سرمایہ دارِ مال مست کے دل میں پیدا ہو گیا تھا' لہٰذا اُس درویشِ خدا مست کے جواب میں اُس نے کہا: ''میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں۔'' تم خود تو جوتیاں پٹخارتے پھرتے ہو اور ہمیں آئے ہو نصیحت کرنے! ہمارے پاس یہ جو مال و متاع اور ساز و سامان ہے آخر ہمیں یوں ہی تو نہیں مل گیا! آخر ہمارے اندر کچھ ذہانت و فطانت ہے' ہم نے کچھ سوچا اور محنت کی ہے' تب ہی تو یہ چیزیں ہمیں حاصل ہوئی ہیں!

آگے فرمایا: ﴿ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ ﴾ ''اور (یہ کہتے ہوئے) وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا''۔جب اس نے باغ کا لہلہاتا ہوا منظر دیکھا تو اس کا نشہ دو آتشہ ہو گیا اور اس کے دل میں ایک خناس سا پیدا ہو گیا۔﴿ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ ﴾ ''اس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہ باغ کبھی بھی تباہ ہو سکتا ہے' اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی''۔

تم خواہ مخواہ مجھے خدا سے اور بُرے انجام سے ڈراتے ہو۔

دیکھئے یہ تھا وہ جہل مرکب جو اُس کے اندر پیدا ہوا۔اس کے اعتقادات و نظریات

میں کہیں بھی کسی دیوی دیوتا کا ذکر نہیں ہے۔ذکر ہے تو اسباب و وسائل اور دُنیوی ساز و سامان کا ہے۔اُس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ فلاں دیوی کا مجھ پر کرم ہے اور فلاں دیوتا کی مجھ پر کرپا ہے۔بلکہ اس کے اگلے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ماننے والا ایک ربّ ہی کا ہے۔﴿ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ ﴾ ''تاہم اگر کبھی مجھے اپنے ربّ کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا''۔جب میرے اندر یہ صلاحیتیں ہیں کہ مجھے یہاں اتنا کچھ ملا ہے تو وہاں اس سے بڑھ کر ملے گا۔تم یہاں جوتیاں پٹخار رہے ہو تو وہاں بھی جوتیاں پٹخارو گے۔یہ ہے اس کا وہ خناس جو ظاہر ہوا۔

اب اُس بندۂ خدا کا جواب ملاحظہ فرمائیے: ﴿ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ ﴾ ''اُس (درویشِ خدا مست) نے اُس (سرمایہ دارِ مال مست) سے کہا جو اُس سے ہم کلام تھا کہ کیا تو نے کفر کیا اُس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے' پھر نطفے سے پیدا کیا' پھر تجھے ایک مکمل انسان بنا دیا؟'' ﴿ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٣٨﴾ ﴾ ''لیکن میرا ربّ تو وہی اللہ ہے (میں تو اس ایک ہی ربّ کا ماننے والا ہوں) اور میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''۔﴿ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ ﴾ ''اور (اے بدبخت!) یہ کیوں نہ ہوا کہ تو جب اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو کہتا جو کچھ اللہ چاہے (وہی ہو گا) کوئی زور نہیں (نہ میرا نہ کسی اور کا) مگر اللہ ہی کی توفیق و تائید سے''۔

یہ ''ماشاء اللہ'' کیا ہے؟ یہ کہ انسان کوئی سہانا منظر اور نعمت وغیرہ دیکھے اور سمجھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت کا ظہور ہے' اس کا کرم اور مہربانی ہے' اسی کی دین ہے' یہ میری قوتوں' میری صلاحیتوں اور میری توانائیوں کا ظہور نہیں ہے! یہ ہے اصل میں توحید کہ اگر آپ کہیں گھر میں داخل ہوں اور وہاں آپ کو کوئی اچھا منظر نظر آئے' بچے کھیل رہے ہوں' گھر کے اندر خوشی کا ماحول ہو' ایک ہنستا بستا ہرا بھرا گھر ہو تو فوراً زبان سے نکلنا چاہیے ''ماشاء اللہ''۔ نگاہ کہیں اسباب و وسائل کی طرف منتقل نہ ہو جائے' بلکہ نگاہ کو ایک ہی زقند میں پہنچنا چاہیے

مُسبّب الاسباب تک کہ وہ ہے جس کے فضل کا یہ ظہور ہے‘ یہ کسی اور کی کوئی مہارت‘ کاریگری ‘ہوشیاری اور کسی اور کی ذہانت وفطانت نہیں ہے۔

اس درویشِ خدا مست نے پھر کہا: ﴿اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾ اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿٤١﴾﴾ ”اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے‘ تو مجھے یقین ہے کہ میرا ربّ (اگر چاہے تو) مجھے تیرے باغ سے بہتر باغ عطا کر دے اور (تیرے) اس (باغ) پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے کہ وہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے (جہاں خاک اڑ رہی ہو)۔ یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور تو (کسی طرح سے بھی) پانی کو کھینچ کر نہ لا سکے“۔

یہ وہ درویشِ خدا مست کی بات تھی جو اُس کی زبان سے نکلی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ)) (١) یعنی ”اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ پراگندہ بالوں والے ہوتے ہیں‘ دروازوں سے ان کو دھتکار دیا جاتا ہے‘ لیکن اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھتا ہے“۔ اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ﴿وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ﴾ ”اور کھینچ لیا گیا (ختم کر دیا گیا) اس کا سارا ثمر“۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی وبا آئی ہو کہ ساری اولاد بھی ہلاک ہوگئی ہو اور کوئی ایک ایسا بگولا آیا ہو جو اُس کے پورے کے پورے باغ کو جھلسا کر چلا گیا ہو۔ ﴿فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْهَا وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا﴾ ”اب وہ باغ پر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر اپنی ہتھیلیاں ملتا رہ گیا‘ جبکہ وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر الٹا پڑا ہوا تھا“۔ یعنی اس بات پر افسوس کہ میری ساری عمر کی محنت اور کمائی اس پر لگی ہوئی تھی اور یہ چشم زدن میں ختم ہوگئی۔ ﴿وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا ﴿٤٢﴾﴾ ”اور وہ کہنے لگا کاش کہ میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا!“

اب یہاں دیکھئے کہ یہ کون سا شرک مراد ہے؟ اس پورے واقعہ میں کسی بعل کا‘ کسی

(١) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب فضل الضعفاء والخاملین۔ عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ۔

دیوی یا دیوتا کا اور کسی لات ومنات اور عزیٰ کا کوئی ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو ربّ کا ہے کہ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ﴾ ”اور اگر کبھی میں اپنے ربّ کی طرف لوٹا دیا گیا......“ یہ اصل میں مادے اور اسباب و وسائل پر توکل ہے‘ اپنی توانائیوں‘ ذہانت‘ دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کا گھمنڈ ہے جسے مذکورہ بالا رکوع میں شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مادہ پرستی کا شرک ہے جو پہلے شاید شاذ ہوتا ہو‘ لیکن آج کائناتی (universal) ہے۔ سائنس اسی بنیاد پر پروان چڑھی اور اُبھری ہے۔ یہ اس کائنات کے تمام مظاہر فطرت (phenomena) کو ایسے بیان کرتی ہے کہ یہ خودکار نظام ہے اور اس میں طبیعی قوانین عمل پیرا ہیں۔ مثلاً بھاپ اٹھی‘ ہوا اُسے اِدھر سے اُدھر لے گئی‘ بادل بنے اور بارش برسی۔ اس میں کہیں خدا کی مشیت‘ خدا کے ارادہ‘ خدا کے اِذن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہوا ہے کہ اگر خدا کا اقرار ہے بھی تو محض اس حد تک کہ وہ معاذ اللہ کسی کونے میں بیٹھ گیا ہے اور یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ ہمارا سارا توکل اور اعتماد مادی اسباب و وسائل پر ہے۔ اور اس شرک فی التوکل یا مادہ پرستی کے شرک میں کم وبیش ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔

اس کو ایک حدیث کے حوالے سے سمجھئے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ زُہد کی تعریف اس طرح بیان فرمائی کہ:

((اَلزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰـكِنَّ الزَّهَادَةَ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِیْ یَدَیِ اللّٰهِ)) (١)

”دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال ودولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے‘ بلکہ دنیا میں زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ نہ ہو جائے اس چیز سے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے“۔

یعنی تم عام طور پر سمجھتے ہو کہ حلال چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا جائے تو یہ زہد ہے‘ یعنی نہ اچھا کھانا‘ نہ اچھا پہننا‘ حالانکہ اللہ نے یہ چیزیں حلال کی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

(١) سنن الترمذی‘ کتاب الزهد عن رسول الله ﷺ‘ باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط﴾ (الاعراف:۳۲)

”(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں (ممنوع کر دیں)؟“

بلکہ زُہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر تمہارا وثوق، اعتماد اور توکل زیادہ ہو جائے اس سے کہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے، یعنی اسباب و وسائل اور دولت وغیرہ۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جیب میں پیسہ ہے تو دل کو سکون ہے، جیب میں پیسہ نہیں تو دل اڑا ہوا ہے، اس لیے کہ اللہ کے خزانوں پر، اللہ کی رزّاقیت اور قدرت پر ہمارا اتنا اعتماد اور یقین نہیں جتنا کہ پیسے پر ہے، بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اب اسے شرک کہہ لیں یا کفر کہہ لیں۔ جیسے ایک درویش نے کہا ہے: ”جو دم غافل سو دم کافر“ کہ انسان کا جو سانس غفلت میں بسر ہوتا ہے تو درحقیقت اس کا وہ وقت ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے۔

دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے توحید کی کتنی تلقین کی ہے! آپ ﷺ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو تاکید فرمائی کہ اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ ”اگر تمام انسان مل کر تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے حق میں لکھ دیا ہے، اور تمام انسان مل کر اگر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے خلاف لکھ دیا ہے۔“(۱) جب تک انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ تمام بیم و رجاء کا مرکز اللہ کی ذات ہو جائے، ماسوی اللہ سے امید اور خوف دونوں منقطع ہو جائیں تو گویا اصل توحید حاصل نہیں۔ توحید کا نام ہی تو ولایتِ خداوندی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ”سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے یقیناً کسی خوف اور غم کا موقع نہیں ہے“۔ ان کی امیدیں اور ان کا خوف سب ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی ذات پر مرتکز ہو جاتا ہے۔ امید ہے تو اللہ سے اور خوف ہے تو اللہ سے۔ اُن کا ایمان اور یقین ہوتا ہے کہ کسی

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع۔

اور کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ کوئی میری بگڑی نہیں بنا سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے، کوئی میری تکلیف رفع نہیں کر سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ تو خوف اور امید دونوں جب تک جملہ مخلوقات سے منقطع ہو کر اللہ کی ذات سے منسلک نہ ہو جائیں انسان توحید کا لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔ آج کا انسان اس مادہ پرستانہ فکر کی وجہ سے اس سے بہت محروم ہو چکا ہے۔ البتہ زبان سے لا الٰہ کہہ دینا آسان ہے، اس میں کوئی مشکل نہیں پڑتی۔

بعض مذہبی نزاعات اور ان کا حل

اب آیئے ذرا ”شرک فی الصفات“ کے کچھ دوسرے پہلوؤں کی طرف کہ جن سے بعض مذہبی نزاعات رونما ہوئے ہیں۔ شاید آپ کو ان کا کوئی حل میسر آ جائے۔ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں ایک بات تو یہ جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں بطور صفت بھی اور بطور اسماء بھی۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ جب اُس لفظ کو حالت نکرہ میں لاتے ہیں تو وہ اللہ کی صفت ہے اور جب اسے معرّف باللّام کرتے ہیں تو وہ اللہ کا نام ہے۔ مثلاً ”سمیعٌ“ اللہ کی صفت ہے کہ اللہ سننے والا ہے، جبکہ ”السمیع“ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کے اسماء و صفات ہی کے حوالے سے حاصل ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ”آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ“ کہ میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے۔ تو ہمارا اللہ کے ساتھ جو ذہنی اور قلبی رشتہ ہے وہ اس کے اسماء و صفات کے حوالے سے ہے۔

قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے: ﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ”جتنے اچھے نام ہیں اسی کے ہیں“۔ پھر یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں جو نام آ گئے ہیں وہ تو یقیناً اللہ کے ہیں اور جن صفات کا اثبات ہو گیا ہے وہ اللہ کے لیے ثابت ہیں، لیکن چند صفات کو بنیادی قرار دیا گیا ہے کہ بقیہ صفات انہی کی فروع اور شاخیں (corollaries) ہیں۔ مثلاً صفتِ علم اللہ تعالیٰ کی ایک بنیادی صفت ہے اور سمیع، بصیر، لطیف، خبیر یہ تمام اصل میں علم ہی کے مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ”قدرت“ ہے۔ اب اس

کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام آ جائیں گے' مثلاً : اَلْمُعِزُّ ''عزت دینے والا'' اَلْمُذِلُّ ''ذلیل کرنے والا'' الرَّافِع ''اٹھانے والا'' الْخَافِض ''گرانے والا'' الباسِط ''کشادگی دینے والا'' القَابِض ''تنگی دینے والا'' یہ سب اس کی صفتِ قدرت ہی کی فروع اور اس کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات یہ ہیں (اگرچہ مختلف علماء' محققین اور متکلمین کے ہاں یہ مختلف ہیں): (۱) وجود[1] (۲) حیات' (۳) قدرت' (۴) علم' (۵) ارادہ' (۶) کلام۔ وہ الحیّ ہے' زندہ ہے' اس کا وجود حیات والا ہے۔ وہ صاحب قدرت ہے' صاحب علم ہے' صاحب ارادہ ہے' متکلم ہے' کلام کرتا ہے۔ اِن تمام صفات کے ساتھ جب آپ تین چیزیں جوڑ لیں گے کہ اس کی یہ صفت مطلق ہے' ذاتی ہے اور قدیم ہے تو یہ توحید ہے۔ اور اگر مطلق ہونے میں' قدیم ہونے میں اور ذاتی ہونے میں کسی اور کو کسی پہلو سے شامل کر لیا گیا تو یہ شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حیات مطلق ہے' ذاتی ہے اور قدیم ہے' جبکہ ماسوی اللہ کی حیات ذاتی نہیں عطائی (اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ) ہے' مطلق نہیں مقید اور محدود ہے' قدیم نہیں حادث ہے۔ اگر یہ چیزیں پیشِ نظر رہیں تو توحید میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو کسی ایک پہلو سے مجروح کر دیا گیا تو یہ شرک بن جائے گا۔

اسی طرح علم کے بارے میں توحید یہ ہے کہ اللہ کا علم ذاتی ہے جبکہ ماسوی اللہ کا علم عطائی ہے۔ ماسوی میں سب شامل ہیں۔ جب فرشتوں سے کہا گیا کہ بتاؤ ذرا ان چیزوں کے نام تو اُن کا جواب تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط﴾ (البقرۃ: ۳۲) ''تو پاک ہے (اے پروردگار!) ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا (عطا کیا) ہے''۔ تو معلوم ہوا کہ فرشتے ہوں' انبیاء ہوں' رسول ہوں' اولیاء اللہ ہوں' کوئی بڑے سے بڑا علاّمہ' فہّامہ ہو' کسے باشد' سب کا علم عطائی ہے ذاتی نہیں' حادث ہے قدیم نہیں' محدود ہے مطلق اور لامتناہی نہیں۔ یہ تینوں قیود اگر موجود ہیں تو شرک نہیں ہے' اور اگر ان میں

(۱) اللہ تعالیٰ کی صفت ''وجود'' کے بارے میں علماء' محققین اور متکلمین کے ہاں ایک باریک سی بحث ہے کہ ''وجود'' صفت ہے یا نہیں۔

سے ایک قید بھی ہٹ گئی تو شرک ہو جائے گا۔

مسئلہ علمِ غیب

اب ذرا ''علم غیب'' کے مسئلے کو حل کر لیجیے! یہ ہمارے ہاں کے مہتم بالشان مسائل میں سے ایک ہے اور اس میں بہت طویل بحثیں اور جھگڑے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو علمِ غیب حاصل ہے یا نہیں؟ ایک طرف سے اس کی پُر زور نفی ہے اور ایک طرف سے اثبات ہے کہ نبی اکرم ﷺ ''عالمُ الکُل'' اور ''عالِمُ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' ہیں۔ اور اِن دونوں مکاتبِ فکر میں جو رسہ کشی ہے وہ دراصل ''علم غیب'' کی تعریف (definition) کا اختلاف ہے۔ مجھ میں الحمد للہ معاملے کی تحقیق کا داعیہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی اچھی طرح سے تحقیق کر لی جائے' اور یہ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر احسانات میں سے ایک احسان ہے۔ میں ابھی میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا کہ ساہیوال میں ایک بریلوی مکتب فکر کے عالم دین کے پاس گیا اور پوچھا کہ علم غیب کے بارے میں کیا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں آپ کا موقف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے علم کے بارے میں یہ تینوں قیدیں مانتے ہیں کہ آپ ﷺ کا علم ذاتی نہیں عطائی ہے' آپ ﷺ کا علم قدیم نہیں حادث ہے' آپ ﷺ کا علم غیر محدود نہیں محدود ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس پر اپنے مکتب فکر کے علماء کی تحریریں دکھائیں کہ ہماری طرف سے ان تینوں باتوں کا برملا اعتراف اور اقرار ہوتا ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ کم از کم ان تینوں چیزوں کو اگر تسلیم کیا جائے تو پھر میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے اور میرے نزدیک اس میں شرک والی بات نہیں ہے۔ تو دراصل اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ علم غیب کی definition مختلف ہو رہی ہے۔ جو اِس غیب کی نفی کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طریقے سے define کرتے ہیں اور جو غیب کا اثبات کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طرح سے define کرتے ہیں۔ جو اس کا اثبات کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں اور جو نفی کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں' لیکن ایک جھگڑا ہے کہ حل نہیں ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو ''غیب'' کا لفظ کئی بار آیا ہے کہ ﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ﴾ ''وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے'' تو یہ ہمارے اعتبار سے ہے۔ اللہ کے لیے تو کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں۔ ہر شے آنِ واحد میں اس کے سامنے حاضر ہے۔ اس کے لیے غیب کا کیا سوال ہے! اللہ کے لیے اگر غیب کا تصور بھی آپ کریں گے تو کفر ہو جائے گا۔ جو چیزیں اللہ نے انسانوں کی نگاہ سے اوجھل رکھی ہیں وہ غیب ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر سارے حقائق ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں تو پھر امتحان کیسا! اگر جنت نگاہوں کے سامنے ہو' دوزخ بھڑکتی نظر آ رہی ہو اور فرشتے نگاہوں کے سامنے موجود ہوں تو کون فرعون' کون نمرود' کون ابوجہل ہو گا جو انکار کرے گا! وہ تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے اور پورے پورے مؤمن ہوں گے۔ اس لیے کہ غیب تو پھر شہادہ بن کر سامنے آ جائے گا۔ جبکہ امتحان تو اسی میں ہے کہ مانو ہمیں غیب میں رہتے ہوئے' مانو فرشتوں کو اِس کے باوجود کہ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں' مانو جنت اور دوزخ کو اس کے باوجود کہ وہ تمہارے لیے غیب ہیں۔ تو اس لفظ ''غیب'' کو اگر سمجھ لیا جائے تو جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

دراصل انسانوں کے علم کے آگے ایک پردہ حائل کر دیا گیا ہے اور علم کو شہادہ اور غیب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو نبوت عطا کرتا ہے تو اسے اس غیب والے علم میں سے کچھ حصہ دیتا ہے' تبھی تو وہ نبی بنتا ہے! اگر اس کا علم بھی ہمارے علم کی طرح ہو تو وہ نبی کیسے ہو گیا! اسے تو جنت کی سیر کرائی جاتی ہے جو میرے اور آپ کے لیے غیبِ مطلق ہے۔ اسے دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے جو ہمارے لیے غیب ہے۔ فرشتے اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل مَلکی شکل میں نبی اکرم ﷺ نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی ﴿۱۴﴾ عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی ﴿۱۵﴾ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ (النجم)

''اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدرَۃ المنتہٰی کے پاس اُس کو (جبرائیل ؑ کو) اترتے دیکھا' جہاں پاس ہی جنت الماٗویٰ ہے۔ اُس وقت سِدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

یہ مشاہدات عالمِ غیب کے ہیں نہ کہ عالمِ شہادہ کے۔ یہ جنت اور دوزخ کے مشاہدات ہیں' یہ عالم ملکوت کے پردے اٹھائے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَکَذٰلِکَ نُرِیْ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...... ﴾

(الانعام:۷۵)

''اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کراتے رہے......''

تو معلوم ہوا کہ عام انسانوں کے لیے جو چیزیں غیب کے درجے میں ہوتی ہیں نبی کو اُن میں سے کچھ دیا جاتا ہے تب ہی وہ نبی بنتا ہے' ورنہ نبوت کا سوال ہی نہیں۔ اس کو قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے۔ سورۃ الجن میں فرمایا گیا:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ......﴾ (الجن:۲۶'۲۷)

''اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے' وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' مگر اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے......''

البتہ ماسوی اللہ کے لیے کُل غیب کے احاطے کا اگر تصور بھی ہو گیا تب تو کفر بھی ہو گیا اور شرک بھی۔ کُل غیب تو دُور کی بات ہے' اگر کُل حاضر کا تصور بھی ذہن میں آ گیا تو یہ بھی کفر اور شرک ہے۔

جس طرح ''شرک فی الذات'' کے ضمن میں قرآن مجید کا اہم ترین مقام سورۃ الاخلاص ہے' اسی طرح ''شرک فی الصفات'' یا بالفاظِ دیگر ''توحید فی الصفات'' کے ذیل

میں قرآن مجید کا عظیم ترین مقام آیت الکرسی ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی بھی شے کا' سوائے اس کے جو اللہ چاہے''۔ علمِ حاضر بھی اللہ ہی کا عطا کردہ ہے' ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ آنکھ دیکھ رہی ہے تو اسے اللہ دکھا رہا ہے تو دیکھ رہی ہے' ورنہ آنکھ کے بس کا روگ نہیں ہے کہ دیکھ سکے۔ کان بھی سن رہے ہیں تو اللہ کے سنوانے سے سن رہے ہیں' ورنہ کانوں کا ذاتی وصف نہیں ہے کہ وہ سن سکیں۔ مخلوق کے ذاتی وصف اور صفت کا تو ہم نے انکار کر دیا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ ذاتی وصف اور ذاتی صفت تو ہے ہی صرف اللہ کے لیے۔ لہٰذا علمِ حاضر کے جو ذرائع ہیں وہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ذاتی نہیں' عطائی ہیں اور اِن کا بھی اللہ تعالیٰ نے دائرہ مقرر کر دیا ہے۔ آنکھ کی جو حد ہے اتنا ہی دیکھے گی اس سے آگے نہیں۔ البتہ دُوربین لگا کر کچھ مزید دیکھ لے گی' لیکن پھر دُوردبین کی بھی ایک حد ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا علمِ حاضر ہو یا علمِ غیب' اگر ماسویٰ اللہ کے لیے کُل کا احاطہ کریں گے تو شرک ہو جائے گا' ورنہ نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہم انبیاء کے علم کو ناپیں اور تولیں تو اس سے بڑا پاگل پن اور اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو نوعیت کے اعتبار سے بھی ہمارے علم سے مختلف ہے۔ اسے ہم کیسے ناپیں گے! ہمارا علم تو علم بالحواس اور علم بالعقل ہے' جبکہ ان کا علم' علم بالوحی ہے۔ لہٰذا جب حصولِ علم کے ذرائع اور مآخذ ہی مختلف ہوں اور ہم اپنے علم سے اُس علم کو ناپنے لگ جائیں تو اس سے بڑی حماقت اور اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کہ کسی شے کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دینا۔ اسے منطق میں ''قیاس مع الفارق'' کہتے ہیں کہ جو چیزیں بنیادی طور پر اور تقسیم کے اعتبار سے ہی مختلف ہوں آپ ان کو ایک دوسرے پر قیاس کریں اور ان کو ایک دوسرے کے پیمانوں سے ناپ رہے ہوں۔ اور یہی ہے اصل مغالطہ۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم چاہا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دے دیا۔ ہم کون ہیں کہ ناپیں محمدٌ رسول اللہ

ﷺ کے علم کو! جو یہ کہے گا کہ حضرت محمد ﷺ کا علم لامتناہی ہے' اور اللہ ہی کے علم کی طرح کامل اور کُل ہے وہ مشرک ہے۔ لیکن جو اِس کو اپنے تئیں ناپ تول کر بتائے گا کہ آپ ﷺ کا علم اتنا ہے تو وہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر کوئی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے علم کا حدود اربعہ خود معین کرنے بیٹھ گیا ہے تو یہ بھی کم درجے کی گمراہی نہیں ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس جو علم بھی تھا اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا۔ انہیں جتنا دکھایا اللہ تعالیٰ نے دکھایا' جو بتایا اللہ تعالیٰ نے بتایا۔ آپ ﷺ نے کوئی غیب کی خبر دی تو اپنی ذات سے نہیں دی بلکہ اللہ کی بتائی ہوئی دی۔ جو لوگ انبیاء کے لیے علمِ غیب کی نفی کرتے ہیں وہ غیب کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ علم جو خود حاصل ہو وہ غیب ہے۔ جبکہ خود تو یہاں پر چھٹانک بھر علم بھی حاصل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ علم تو چاہے حاضر کا ہو چاہے غیب کا ہو وہ سب اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ تو اصل میں یہ علم غیب کی تعریف ہی کا سارا فساد ہے کہ تم نے غلط تعریف کی ہے جس کی بنا پر غیب کی نفی کر رہے ہو۔ تمہارا یہ موقف نہ تو کسی حدیث نبوی ﷺ سے منقول ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی کسی آیت سے ماخوذ ہے۔ قرآن کے الفاظ تو یہ ہیں:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝٢٦ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ......﴾ (الجن: ٢٦'٢٧)

''وہ عالِم الغیب ہے' پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر جس کو پسند کر لے اپنے رسولوں میں سے......''

چنانچہ یہ غیب کے پردے اللہ تعالیٰ اٹھاتا ہے صرف انبیاء و رُسل کے لیے۔ البتہ کتنے اٹھاتا ہے' کتنی اس کی مشیت ہے' کس کو کتنا دکھاتا ہے' یہ وہ جانے اور اس کا رسول جانے جس نے دیکھا۔

قرآن مجید میں سورۃ النجم میں شب معراج کا ذکر ہوا ہے کہ وہاں کیا دیکھا محمد ﷺ نے' تو اس میں ایک بہت اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ اب میں اور آپ کیا سمجھ سکیں گے کہ وہاں محمد ﷺ نے کیا دیکھا! اگر یہ بیان بھی کر دیا جائے تو ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ وہاں محمد ﷺ نے کیا دیکھا۔ لہٰذا قرآن مجید نے صرف یہ

کہا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ ''انہوں نے دیکھا اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی پر کیا تھا' اگر قرآن اسے بیان بھی کرے تو ہماری سمجھ میں کیا آئے گا! لہٰذا صرف فرمایا گیا: ﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾﴾ ''جب کہ ڈھانپے ہوئے تھا اُس بیری کے درخت (سِدرہ) کو جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ تم کیا سمجھو گے' لہٰذا تمہیں کیا بتائیں کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا! بس تم اسی پر قناعت کرو کہ ''دیکھا (ہمارے بندے محمد ﷺ نے) اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ اس سے آگے تمہارے حاشیۂ خیال میں آنے والی بات نہیں۔ یہ ہے معاملہ ہمارے علم اور ہماری حدود کا اور ہم اس کو لے کر ناپنے چلیں انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کو' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سید الانبیاء' سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے علم کو' تو یہ ہماری بنیادی غلطی اور بنیادی قصور ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ عالم الکُل ہیں' عالمُ ما کان وما یکون ہیں تو یہ عقیدے کی خرابی اور شرک ہے۔

تاہم ''مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' کو بھی سمجھ لیجیے کہ کہنے والا اگر اس نیت سے کہہ رہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا علم ماضی پر بھی مشتمل ہے اور مستقبل پر بھی تو وہ غلط تو نہیں! اس لیے کہ ماضی کی بھی بہت سی خبریں نبی اکرم ﷺ کو دی گئیں اور مستقبل کی بھی بہت سی خبریں آپ ﷺ کو دی گئیں۔ جب تک کہنے والا اس احاطے کے ساتھ نہ کہے کہ کُل ماضی اور کُل مستقبل کا علم آپ ﷺ کے پاس ہے' تب تک اس میں کوئی حرج اور کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ صرف دو کیٹیگریز کے اعتبار سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ قرآن مجید کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ((فِیْهِ نَبَأُ مَا کَانَ قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ......))(۱) ''اس میں جو کچھ تم سے پہلے ہوا ہے اس کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے بعد ہونے والا ہے اس کی خبریں بھی ہیں''۔ تو قرآن میں اگر ماضی کی خبریں بھی ہیں اور مستقبل کے حالات کے بھی اشارے موجود ہیں تو آپ ﷺ کیا قرآن کا علم بھی نہیں رکھتے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ ماضی میں کیا ہوا اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ سارے فساد کی جڑ ہے تو وہ ایک لفظ ''کُل'' ہے۔ ''کُل'' اگر ماسوی

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاءَ فی فضل القرآن۔

اللہ کے لیے آ گیا تو یہ کفر بھی ہے اور شرک بھی۔ ''کُل'' کی شان تو صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کی ہے۔ وہ ﴿بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ہے' ﴿عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہے۔ ''کُل'' کا لفظ اگر آپ کسی اور کے لیے لے آئے تو وہ گویا مطلق (absolute) ہو گیا جو کہ کفر و شرک ہے' حالانکہ absolute ذات صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ صرف ایک لفظی نزاع اور اصطلاح کا جھگڑا ہے' تعریف (definition) کا ٹکراؤ ہے' ورنہ اس میں کوئی بنیادی اختلافی مسئلہ موجود نہیں ہے۔

خالق اور مخلوق کے ارادہ واختیار میں فرق وتفاوت

اور آگے چلیے! ارادہ ہم بھی کرتے ہیں اور ارادہ اللہ کا بھی ہے۔ لیکن وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ ہے کہ جو ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا ہے' جبکہ کسی اور کی یہ شان نہیں۔ سب کے ارادے اللہ کے ارادے کے تابع ہیں۔ اللہ کا ارادہ مطلق ہے' کسی کے تابع نہیں' اسے کہیں سے sanction اور منظوری نہیں لینی۔ ایسی بات نہیں کہ صدرِ امریکہ کوئی بل پاس کرانا چاہتا ہو لیکن پارلیمنٹ منظوری نہ دے اور اس کی جان مخمصے میں پھنس جائے۔ جیسے وقت کا فرعون جو خدائی کا مدعی تھا' اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرارداد (resolution) اپنے دربار میں پیش کی' لیکن درباری نہیں مانے تو فرعون کے ہاتھ بندھ گئے۔ یہ مطلق شان اللہ کی ہے کہ وہ جو ارادہ کر لے کر گزرنے والا ہے۔ مشیتِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ﴾ ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ ﴿یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ﴾ ''وہ جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے''۔ ﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ ''تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے''۔ اُس کا اختیار مطلق ہے۔ اس کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ چاہتا تو آنِ واحد میں ابوجہل کو ہدایت دے دیتا۔ ﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ط﴾ (المائدۃ:۱۸) ''وہ جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے''۔ اگر وہ ابوجہل کو بخشنا چاہے تو اسے معاذ اللہ کون روکے گا! اور اگر وہ کسی بڑے سے بڑے نیک آدمی کو جہنم میں جھونکنا چاہے تو اس کا اختیار مطلق ہے' اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

ہمارے اور اہل تشیع کے مابین عقائد میں ایک بڑا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ ہم اللہ پر عدل واجب نہیں سمجھتے' جبکہ ان کے نزدیک اللہ پر عدل واجب ہے۔ ان کے نزدیک مجرم کو سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور بے گناہ کو سزا نہ دینا اس پر واجب ہے' جبکہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ مالک الملک ہے' مختارِ مطلق ہے' مشیتِ مطلقہ کا حامل ہے' وہ بڑے سے بڑے نیکوکار کو بھی جہنم میں جھونکنے میں بااختیار ہے۔ البتہ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جھونکے گا۔ امر واقع (De facto position) کوئی اور ہے' لیکن اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اس لیے کہ جب کسی پر کوئی چیز واجب ہوگئی تو وہ مطلق شان تو نہ رہی! ہمارے نزدیک اللہ کی شان ہے ہی مطلق۔ اگر ہم اللہ پر عدل کو واجب مانیں تو وہ تو گویا ایک قانون کا پابند ہو گیا۔ حالانکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ اس نے جو قانون خود بنائے اس کا بھی پابند نہیں' جب چاہے انہیں توڑ دے۔ اس نے آگ میں جلانے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کر لے' پانی میں سطح برقرار رکھنے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کر لے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین جب چاہے توڑے' وہ اپنی مِلک میں جس طرح چاہے تصرف کرے' اس کا اختیار مطلق ہے۔ جبکہ ہمارے اختیار اور ہماری مشیت کی کیا حیثیت ہے؟ فرمایا گیا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الدھر: ۳۰) اس کے دو بڑے پیارے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ: ''اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ نہ چاہے''۔ لیکن یہ تو ہے نتیجہ کے اعتبار سے' یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محتاط ترجمانی ہے۔ دوسرا ترجمہ ہے: ''اور تم چاہ بھی نہیں سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے''۔ یہ ہے اصل میں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت' کہ تمہاری مشیت بھی اس کی مشیت کے تابع ہے۔ تم چاہ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ نہ چاہے۔ یہ ہے اصل میں توحید کا وہ مقام کہ جہاں انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے میں فنا ہو جاتا ہے کہ پروردگار! جو تو چاہے بس وہی ہے' میں کیا چیز ہوں اور میری مشیت اور ارادے کی کیا حیثیت ہے! اس میں چوٹی کی بات یہ ہے کہ سید المرسلین' محبوب ربّ العالمین حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے حوالے سے اگر دھوکہ ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پیش بندی کے طور پر فرما دیا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾

(القصص:٥٦)

''یقیناً (اے نبی ﷺ!) آپ نہیں ہدایت دے سکتے جسے بھی آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔

اب اس تنبیہہ اور راہنمائی کے بعد کہاں شرک کا امکان باقی رہ سکتا ہے! قرآن مجید نے تو ایسے سب راستے مسدود کر دیے ہیں جن سے شرک در آ سکتا تھا۔ اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ اندازِ تخاطب ہے ہی اس لیے کہ کہیں مغالطے کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو جائے' اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ الحمد للہ یہ اُمت بحیثیت مجموعی شرک سے بچی ہوئی ہے۔

خدا اور انسان کی حیات کا تقابل

اب آیئے حیات کی طرف۔ ہم بھی زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی زندہ ہے' لیکن ہماری زندگی اوّل تو یہ کہ اپنی نہیں بلکہ عطائی ہے۔ ع ''لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے''۔ دوسرے یہ کہ اس حیات کا دار و مدار اسباب پر ہے۔ کھائیں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مر جائیں گے' آکسیجن حاصل نہ رہے تو مر جائیں گے۔ اگر پندرہ بیس دن مسلسل جاگیں تو موت واقع ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ یہ حیات بڑی ہی کمزور اور بے چاری ہے۔ یہ بڑی ہی مجبور زندگی ہے جو دوسروں کے سہارے پر قائم ہے۔ اس کے ساتھ ضعف اور احتیاج ہے' آرام اور نیند کی ضرورت ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی حیات کیا ہے؟ آیت الکرسی میں ہے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَىُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) کہ اس کی زندگی تو وہ زندگی ہے جس میں نہ اونگھ ہے اور نہ نیند ہے۔ اس کی قوتوں میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ڰ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝۳۸﴾ (قٓ)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے' چھ دنوں میں پیدا کیے اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی''۔

یعنی خالق کائنات کی زندگی کو اپنی زندگی کے مظاہر پر قیاس نہ کر بیٹھنا۔ اُس کی زندگی اسباب اور سہاروں کے بل پر قائم نہیں' بلکہ قائم بالذات ہے' عطائی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ ہماری زندگی کو اُس کی زندگی کے مقابلے میں زندگی کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو صرف صورتِ حیات ہے' حیات نہیں ہے۔ حیات تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ اسی طرح ہمارے پاس صرف صورتِ علم ہے' علم نہیں ہے۔ العلم تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ ہمارے اندر تو صرف ارادے کی ایک صورت ہے' حقیقتاً اور مطلقاً ارادہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہمارے اندر مشیت کی صرف ایک جھلک سی ہے' جبکہ اصل مشیت تو اللہ کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکا لیجیے کہ مخلوقات کی جملہ صفات کو جب صفاتِ خالق کے مقابلے میں رکھا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ معدوم کے درجے میں ہیں' ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ علم ہے' لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ ہمارے اندر حیات ہے' لیکن حیاتِ خداوندی کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اللہ کے مقابلے میں ہمیں کوئی قدرت' علم' مشیت حاصل نہیں ہے۔

میں اس اہم بحث کے لیے نبی اکرم ﷺ کے قولِ مبارک سے سند پیش کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو دعائے استخارہ سکھائی۔ اس دعا کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ صحابہ کرام ؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیں یہ دعا اس طرح تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی کوئی سورۃ ہو۔ دعائے استخارہ کے الفاظ ہیں: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْاَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ......))[1] "اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کی بھیک مانگتا ہوں' اور تیری قدرت سے کچھ قدرت کی بھیک مانگتا ہوں اور میں تیرے فضل عظیم سے کچھ سوال کر رہا ہوں"۔ جیسے حضرت موسیٰ ؑ کے الفاظ سورۃ القصص میں آئے ہیں: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾﴾ "اے میرے ربّ! تو جو بھی میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں"۔ مقامِ عبدیت تو یہی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی۔

ہے کہ ﴿اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ﴾ (فاطر:۱۵) کہ تم ہر معاملے میں اللہ کے محتاج ہو۔ دعائے استخارہ کے مذکورہ بالا تین جملے مقامِ عبدیت کی وضاحت کے لیے بہت عظیم ہیں۔ اگلے دو جملے ہیں: ((فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَ لَا اَعْلَمُ......)) "پس تجھے ہی قدرت حاصل ہے' مجھے کوئی قدرت نہیں' اور تو جانتا ہے مجھے کوئی علم حاصل نہیں۔" اب اگر نبی اکرم ﷺ کے اِن الفاظِ مبارکہ کو اللہ تعالیٰ سے تقابل میں نہ رکھا جائے تو یہ' نعوذ باللہ' جھوٹ ہو جائے گا کہ "مجھے کوئی قدرت اور علم حاصل نہیں"' جبکہ علم تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہے اور نبی اکرم ﷺ کا تو کہنا ہی کیا! اصل میں یہاں تقابل ہے کہ اے پروردگار! تیرے علم کے مقابلے میں میرا علم صفر ہے۔ تیری قدرت کے مقابلے میں میری قدرت صفر ہے۔ تو جب صفاتِ مخلوق کا صفاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تقابل ہوگا تو مخلوق کی صفات معدوم کے درجے میں شمار ہوں گی۔

حضرت موسیٰ ؑ کا جو واقعہ سورۃ الکہف میں نقل ہوا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ سے فرمایا کہ جاؤ ہمارے ایک بندے کے پاس جسے ہم نے علمِ لدُنی عطا فرمایا ہے' تو قرآن مجید میں تو اگرچہ یہ تفصیل موجود نہیں ہے لیکن روایات میں آتا ہے کہ حضرت خضرؑ نے (اگرچہ ان کا نام قرآن میں نہیں ہے) حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ جو کشتی کے کنارے پر آ کر چڑیا بیٹھ گئی ہے اور اس نے سمندر میں چونچ ڈال کر پانی پیا ہے تو اس پانی کو اس سمندر کے پانی سے جو نسبت ہے جان لو کہ کُل مخلوقات کے علم کو اللہ کے علم کے مقابلے میں یہ نسبت بھی حاصل نہیں۔

وجودِ باری تعالیٰ اور نظریۂ وحدت الوجود

اب ذرا نظریہ "وحدت الوجود" کی بحث کی طرف آیئے کہ صرف اللہ کا وجود مطلق ہے' قدیم ہے اور دائم ہے' جبکہ ماسویٰ کا وجود عطائی ہے' محدود ہے' حادث اور فانی ہے۔ گویا وجود تو صرف اسی کا ہے' کسی اور کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ ماسویٰ سے وجود کی نفی ہے۔ یہ "وحدت الوجود" ہے اور درحقیقت یہ توحید فی الصفات کی بلند ترین منزل ہے۔ جو یہاں نہیں

پہنچا وہ فکری سطح کے اعتبار سے توحید کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ میں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ہمارے وہ صوفیائے کرام جو اگرچہ ''وحدت الوجود'' کے قائل ہیں' لیکن انہوں نے ''وحدت الوجود'' کو ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے ساتھ خلط مبحث (confuse) کر دیا ہے' مثلاً ابن عربی' مولانا روم اور دیگر نامور صوفیاءِ اِن کے بارے میں لوگ سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ تو انہیں بلاتأمل مشرک کہہ دیتے ہیں اور باقی لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ وہ گمراہی کی طرف چلے گئے۔ دیکھئے نظریہ ''ہمہ اوست'' کو تو میں بھی کفر اور شرک سمجھتا ہوں۔ لیکن ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فرق کو جان لیجیے! ''ہمہ اوست'' کو یوں سمجھئے کہ برف پگھل کر پانی بن گیا تو برف معدوم ہو گئی اور اب پانی ہی برف ہے۔ اِس اعتبار سے تو یہ کائنات حقیقت قرار پاتی ہے اور' نعوذ باللہ' خدا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجود یہ ہے کہ حقیقتِ وجود صرف خدا کے لیے ہے اور ماسوی کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ان دونوں نظریات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہو گئے۔ اس لیے کہ ''ہمہ اوست'' میں مخلوق حقیقت ہے اور خالق اس میں گم ہے اور ''وحدت الوجود'' میں خالق حقیقت ہے اور مخلوق کا وجود گم ہے۔ لہٰذا جب ان دونوں نظریات کو خلط مبحث کیا گیا تو بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہو گیا۔ جب یہ confusion زیادہ ہوا تو اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اصلاح کی اور انہوں نے ''وحدت الوجود'' کے بجائے ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا۔

وحدت الشہود یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے اور کائنات کا وجود اعتباری ہے اور اُس کا محض عکس ہے۔ جیسے اصل وجود درخت کا ہوتا ہے' لیکن اس کا سایہ جو زمین پر پڑ رہا ہوتا ہے وہ نظر تو آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے اظلال اور سائے ہیں اور ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا:

کلُّ ما فی الکون وھمٌ او خیال

او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ محض وہم ہے یا خیال ہے' یا جیسے شیشے میں کوئی عکس ہوتا ہے یا سایہ۔ آپ شیشے میں نظر تو آ رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں ہوتے نہیں ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں واضح کیا گیا کہ ایک لکڑی لے کر اس کے ایک سرے پر کپڑا باندھیں اور اس کے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیں اور اسے ایک دائرے میں تیزی کے ساتھ حرکت دیں تو دیکھنے والوں کو یہ ایک آتشیں دائرہ نظر آتا ہے' لیکن درحقیقت وہ آگ کا دائرہ نہیں ہوتا' بلکہ شعلے کی حرکت آتشیں دائرے کا روپ دھار لیتی ہے۔ اب دیکھئے اس نظریے میں کائنات اور ماسویٰ کی نفی ہو گئی اور اثبات صرف اللہ کا ہوا۔ ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' میں صرف تعبیر کا فرق ہے' اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ فرق کیا ہے۔ یہ محض سمجھانے کا ایک لطیف سا انداز ہے۔

اس کی ایک اور بہترین تمثیل اِس دَور میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے یہ بیان کی کہ تم ذرا تصور کر کے اپنے ذہن میں تاج محل یا مینارِ پاکستان کا نقشہ لے آؤ۔ یہ گویا تمہاری محض ایک خیالی تخلیق ہے جو تمہارے ذہن میں ہے اور تمہارے ذہن سے باہر اِس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے اوپر بھی تم ہو' اس کے نیچے بھی تم ہو' اس کے باہر بھی تم ہو اور اس کے اندر بھی تم ہو۔ تو یہی نسبت خالق و مخلوق کے مابین ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) ''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے''۔ اور یہ کائنات محض اس کے خیال کے مانند ہے۔ ہمارا خیال تو بڑا کمزور سا خیال ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا خیال بڑا ٹھوس اور پختہ خیال ہے۔ البتہ یہ جان لیجیے کہ جس طرح ہماری ذہنی تصویر کا انحصار اور قیام ہماری توجہ پر ہوتا ہے' جیسے ہی توجہ ہٹتی ہے تصویر بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہے' اسی طرح اس کائنات کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی توجہ سے ہے۔ اُس کی توجہ ہٹے تو یہ معدوم ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ وہ الحیّ القیّوم ہے' از خود ہے اور اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ جیسے تم اپنی توجہ کو مرتکز رکھو گے تو وہ ہیولیٰ تمہارے ذہن میں رہے گا' تم اُس کے قیوم ہو' ایسے ہی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا القیوم ہے' اسے تھامے ہوئے

ہے۔

شفاعت کا مسئلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں

آگے بڑھنے سے پہلے میں ''شرک فی الصفات'' کے ذیل میں ''مسئلہ شفاعت'' کی قدرے وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے ساتھ شفاعت قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔ اس کا انکار کرنے والا قرآن مجید اور حدیث دونوں کی نصوص کا منکر ہو جائے گا۔ آیت الکرسی میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) ''کون ہے جو اُس (اللہ تعالیٰ) کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے؟'' سورۂ طٰہٰ میں فرمایا گیا: ﴿یَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾﴾ ''اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی' اِلّا یہ کہ کسی کو رحمان اِس کی اجازت دے اور اُس کی بات سننا پسند کرے۔'' البتہ اگر کسی کے ذہن میں شفاعت کا تصور یہ ہے کہ کوئی ہستی اتنی زور آور ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عدل کے راستے میں (معاذ اللہ) رکاوٹ بن سکتی ہے' اور اللہ سے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کروا سکتی ہے تو یہ یقیناً شرک ہے۔ اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ شانِ یکتائی کہ وہ ﴿عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہے' ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ ہے' ﴿یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ﴾ ہے' مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر تو وہ (معاذ اللہ) کسی اور کی مرضی کا پابند اور کسی اور سے اِذن کا خواہاں بن کر رہ جائے گا۔ پھر تو وہ اللہ نہ رہا' اس لیے کہ اس کا اختیار اور اس کی قوت محدود ہو گئی! جبکہ اللہ تو وہی ہے جس کی قوت اور اختیارات لامحدود ہیں۔

درحقیقت مشیتِ مطلقہ اور ارادۂ مطلق صرف اللہ کے لیے ہے' کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِذن پا کر شفاعت کرنا یہ یقیناً قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔ اور یہ شفاعت صرف قیامت کے دن ہی نہیں ہوگی' اب بھی ہو رہی ہے۔ کوئی بھی شخص جب کسی دوسرے کے لیے کوئی دعا کرتا ہے تو وہ شفاعت ہے۔ ''شفع'' دراصل دو (۲) کو کہتے ہیں۔ جیسے سورۃ الفجر میں فرمایا گیا: ﴿وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾﴾ ''اور قسم ہے جفت اور طاق کی''۔ تو شفاعت یہ ہے کہ آپ نے اپنی ایک درخواست کہیں پیش کی

اور کسی نے آپ کے لیے سفارش بھی کی۔ تو یہ سفارش دراصل شفاعت ہے کہ اُس نے اپنی بات بھی آپ کی بات کے ساتھ جوڑ دی تو بات دوہری ہو گئی۔ یعنی ایک سائل ہے جو اپنا سوال پیش کر رہا ہے اور ایک اور ہے جو اُس کی سفارش کر رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران بھی یہ ہوتا تھا کہ کسی مسلمان سے کسی خطا یا غلطی کا صدور ہو جاتا تو وہ خود بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا تھا اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا کہ آپ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے میرے لیے سفارش کریں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں اُس مسلمان کے لیے شفاعت تھی۔ اسی طرح قرآن مجید سے ثابت ہے کہ فرشتے بھی انسانوں کے لیے شفاعت کرتے رہتے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (الشوریٰ: ۵) ''وہ زمین والوں کے لیے (اپنے پروردگار سے) استغفار کرتے رہتے ہیں۔'' اسی طرح کا معاملہ میدانِ حشر میں ہوگا۔ انبیاء' صدیقین' شہداء' صالحین اور اولیاء اللہ کو اپنے اپنے مراتب کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملے گی کہ وہ بھی گنہگاروں کے حق میں شفاعت کریں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر کوئی ہستی بھی کسی کے لیے شفاعت نہیں کر سکے گی۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾﴾ (النبا) ''(اُس روز) کوئی نہ بولے گا (کسی کو کلام کرنے کا یارا نہ ہوگا) سوائے اُس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔'' تو شفاعت کا مطلق انکار قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ ﷺ کی نصوص کا انکار ہے۔ البتہ شفاعت کا جو ایک عوامی اور جاہلانہ تصور ہے کہ

خدا جنھوں پکڑے چھڑا لے محمد ﷺ
محمد ﷺ دے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا

یہ شرک کی بدترین صورت ہے۔ اس میں' نعوذ باللہ' اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ایک اور مشیت غالب آ رہی ہے اور اس کے ارادے پر ایک اور ارادہ مُستوَلی ہو رہا ہے۔

’’شرک فی الحقوق‘‘ یا ’’شرک فی العبادت‘‘

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حقوق کو شمار کرنے لگ جائیں تو وہ بے شمار ہو جائیں گے‘ لیکن ’’ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں‘‘ کے مصداق اللہ تعالیٰ کا ایک حق ایسا ہے کہ جس میں اُس کے سارے حقوق آ جاتے ہیں‘ اور وہ حق ہے ’’عبادت‘‘۔ چنانچہ ’’شرک فی الحقوق‘‘ مساوی ہو جائے گا ’’شرک فی العبادت‘‘ کے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون بے شمار مرتبہ آیا ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت اسی حوالے سے ہے کہ ’’اللہ کی عبادت کرو‘ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو‘‘۔ سورۂ ھود کی ابتدائی آیات میں بتایا گیا کہ قرآن مجید کا مقصدِ نزول اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی غرض و غایت کیا ہے۔ فرمایا:

﴿الٓرٰ ۟ قف کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾﴾

’’ا‘ ل‘ ر۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ کی گئیں‘ پھر وہ کھولی گئیں (ان کی تفسیر کی گئی) اُس ہستی کی طرف سے جو کمالِ حکمت والی ہے‘ تمام چیزوں سے باخبر ہے۔ (اور یہ اس لیے نازل ہوئی) کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ یقیناً میں تمہارے لیے اللہ کی طرف سے خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں‘‘۔

یعنی جو اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور ’’توحید فی العبادت‘‘ کے معیار پر پورے اتر جائیں اُن کے لیے میں بشارت دینے والا ہوں کہ ان کے لیے نعمتوں والی جنتیں ہیں۔ اور جو اِس معیار پر پورے نہ اتریں ان کے لیے میں خبردار کرنے والا ہوں کہ ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس بڑا دردناک عذاب ہے۔

سورۃ الکہف کی آخری آیت میں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا:

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا‘ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ پس جو کوئی اپنے ربّ کی ملاقات کا امیدوار ہو اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے‘‘۔

’’عبادت‘‘ کا مفہوم اور اس کے اجزاء

’’شرک فی الحقوق‘‘ یا بالفاظِ دیگر ’’شرک فی العبادت‘‘ کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے لفظ ’’عبادت‘‘ کو سمجھنا ہوگا۔ عربی میں ’’عبد‘‘ غلام اور بندے کو اور ’’عبادت‘‘ غلامی اور بندگی کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی مشہور آیۂ مبارکہ ہے: ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) اس کی صحیح ترین ترجمانی کی ہے شیخ سعدیؒ نے کہ:

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی!

یہ تو ہوا لفظ ’’عبادت‘‘ کا معنی و مفہوم۔ اصطلاح میں ’’عبادت‘‘ اصل میں کیا ہے‘ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے اِس کی صحیح ترین اور جامع ترین تعبیر کی ہے‘ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے‘ کہ: ’’اَلۡعِبَادَۃُ تَجۡمَعُ اَصۡلَیۡنِ‘‘ کہ عبادت دو بنیادوں یا دو جڑوں کو اپنے اندر جمع کرتی ہے‘ یعنی اِس کے دو بنیادی اجزاء ہیں جن کے ملنے سے یہ عبادت وجود میں آتی ہے۔ اور وہ ہیں: ’’غَایَۃَ الۡحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالۡخُضُوۡعِ‘‘ کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہا درجے کی محبت ہو اور اُس کے ساتھ جمع ہو جائے انتہائی درجے کی عاجزی و انکساری کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھ جائے‘ اپنے آپ کو اُس کے سامنے پست کر دے۔ اللہ کی مرضی اور پسند کے مقابلے میں اس کی اپنی کوئی مرضی اور پسند باقی نہ رہے۔ جو اللہ کو پسند ہو وہی اس بندے کو پسند ہو اور جو اللہ کی مرضی ہو اسی پر وہ راضی ہو۔ جو اللہ کا حکم ہو وہ اسے بسر و چشم بجا لائے اور اپنی زندگی کی غایت ہی یہ سمجھے کہ بس اپنے آقا‘ اپنے مالک‘ اپنے ربّ کو راضی کرنا ہے۔ اس کی رضا جوئی ہی اس کی زندگی کا مقصود ہو۔

ویسے تو لفظ ’’عبد‘‘ غلام کے معنی میں آتا ہے اور غلامی کے اندر ایک جبر کا مفہوم ہے۔ دنیا میں جب بھی کوئی کسی کا غلام ہوتا تھا یا اب بھی جو قومیں دوسری قوموں کی غلام ہوتی ہیں تو اِس غلامی میں جبر کا پہلو ہوتا ہے۔ یہ مجبوری اور مارے باندھے کی غلامی ہوتی ہے۔ کوئی اپنی مرضی سے کسی کا غلام نہیں بنتا' بلکہ دوسرا اُس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ لفظ ’’عبد‘‘ کے مفہوم میں چونکہ جبر کا پہلو شامل ہے اس لیے جب دین کے اندر اللہ کی عبادت کا تصور زیر بحث آئے گا تو یہ صراحت ضروری ہوگی کہ اس میں غلامی کا وہ عنصر تو بتمام وکمال موجود ہونا چاہیے کہ جیسے ایک غلام' ایک بندہ اپنے آقا کا مطیع فرمان ہوتا ہے' لیکن اس میں کوئی پہلو جبر کا نہ ہو' بلکہ اپنے آقا اور معبود کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے آپ کو اس کے سامنے بچھا دیا جائے' اور اس کی بندگی اپنی آزاد مرضی سے اختیار کی جائے' جبر سے نہیں۔ گویا عبادت کے دو اجزاء ہیں' ایک ہے کُلی اطاعت اور ایک ہے محبت کہ جو اِس اطاعت کی اصل روحِ باطنی ہے۔ ان دونوں کے مابین باہمی نسبت وتناسب وہی ہے جو ہمارے اِس مادی وجود اور روحانی وجود کے مابین ہے۔ جیسے ہمارا جو جسمِ ظاہری ہے' نظر تو یہی آتا ہے' سارا وزن اسی کا ہے' لیکن اس میں جو اصل حقیقت ہے وہ جان ہے' روح ہے' اسی کی وجہ سے یہ قائم ہے' ورنہ تو یہ متعفن ڈھیر بن جائے گا' قریب ترین اعزہ واقارب بھی دُور بھاگیں گے۔ میں یہاں لفظ ’’روح‘‘ کو ’’جان‘‘ کے ہم معنی کے طور پر استعمال کر رہا ہوں' جو غلط العام تصور ہے۔ اِس وقت ’’روح‘‘ اور ’’جان‘‘ کا فرق زیر بحث نہیں ہے۔ تو جیسے نگاہ میں آنے والا ہمارا یہ ظاہری وجود ہے' وزن اسی کا ہے' لیکن اس میں اصل قدر و قیمت اُس روحِ باطنی کی ہے جو اِس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے' بالکل اسی طرح عبادت کا اصل جسد تو اطاعت ہے' نظر تو یہی آئے گا کہ فلاں آدمی نے اللہ تعالیٰ کا حکم مانا' اس نے اللہ کے حکم کے مطابق نماز پڑھی' اس نے اللہ کے حکم کے مطابق روزہ رکھا' اس نے اللہ کے حکم کے مطابق فلاں چیز کو حلال جانا اور فلاں چیز کو حرام جانا' لیکن اگر اس میں محبت کا پہلو نہیں ہے تو پھر یہ عبادت ایک بے جان جسد ہے' جس میں کوئی روح نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اس دَور میں اسے خوب واضح کیا ہے کہ:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

اور:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصورات

اگر عبادت کے اندر محبتِ خداوندی کی روح جاری وساری نہ ہو تو یہ اعمال محض رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔ تو عبادت کے یہ دو اجزاء بہت اہم ہیں' ایک اطاعتِ کُلی اور دوسرا محبتِ خداوندی۔[1]

عبادت کے ذیل میں تیسری چیز کچھ مراسمِ عبودیت ہیں جو اپنی بندگی کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ انسان کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ کسی کی تعظیم اور نیازمندی کے اظہار کے لیے وہ کچھ صورتیں اختیار کرتا ہے' مثلاً جس کی تعظیم مقصود ہو انسان دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے سامنے سینہ تان کر نہیں بلکہ جھک کر کھڑا ہوا جاتا ہے۔ پھر جس کی مزید تعظیم مقصود ہو اُس کے سامنے رکوع کیا جاتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر سجدہ کیا جاتا ہے۔ سورج کی تعظیم مقصود ہو تو لوگ سورج کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں' سربسجود ہو جاتے ہیں۔ تو یہ ظاہری اعمال کہ جن میں اس عبادت کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے' مراسمِ عبودیت کہلاتے ہیں۔

عبادت کے ذیل میں چوتھی بحث ’’دعا‘‘ ہے جو عبادت کا لبِّ لباب اور اصل خلاصہ ہے۔ کسی ہستی کو پکارا جاتا ہے اُسے مشکل کشا' حاجت روا' تکلیفوں کا دُور کرنے والا سمجھ کر۔ اسے قادرِ مطلق سمجھتے ہیں تب ہی تو اسے پکارتے ہیں! اسے سمیع وبصیر سمجھتے ہیں تب ہی تو اسے پکارتے ہیں! اسے سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری تکلیفیں رفع کر سکتا ہے تو اس سے استغاثہ

---

(۱) اس ضمن میں ماہر القادری مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے:

جو سجدے میں دل بھی جھکے گا نہ ماؔہر
وہ کچھ اور شے ہے' عبادت نہ ہو گی! (مرتب)

کرتے ہیں' استدعا کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ))(۱) ''دعا ہی اصل عبادت ہے''۔ایک اور جگہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ))(۲) ''عبادت کا جوہر دعا ہے''۔

عبادت کے ذیل میں پانچویں اور آخری بحث ہے خلوص و اخلاص۔کوئی عبادت اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہے جب تک کہ اُس میں خلوص اور اخلاص نہ ہو۔خلوص اور اخلاص کی ضد ہے ریا کاری' یعنی محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی عمل کرنا۔اسی کے ساتھ ایک لفظ آتا ہے ''سُمعَه''۔یعنی محض لوگوں کو سنانے کے لیے کوئی عمل انجام دینا۔''ریا'' ہے دکھانا اور ''سُمعَه'' ہے سنانا۔تو عبادت میں جب ریا اور سُمعہ آ جائیں گے تو وہ عبادت قبول نہیں ہوگی' اس لیے کہ خلوص و اخلاص جو قبولیت کی اصل شرط ہے' وہ مفقود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کو بھی واضح کیا گیا:﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ...... ﴾ (البيّنة:۵) ''اور انہیں تو حکم بس یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (غلامی اور اطاعت) کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے' یک سو ہو کر۔'' اگر عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی کچھ دکھانے اور سنانے کا عنصر شامل ہو گیا' لوگوں سے اپنی تعریف کرانا یا کوئی اور دُنیوی منفعت حاصل کرنا مقصد کے طور پر پیشِ نظر ہوا تو گویا خلوص اور اخلاص ختم ہوا اور عبادت میں ریا اور سُمعہ شامل ہو گئے اور اللہ کے ہاں ایسی عبادت مردود شمار ہوگی۔تو عبادت کے یہ پانچ پہلو یا پانچ اجزاء ذہن میں متعین کر لیجیے۔ یعنی: (۱) اطاعت (۲) محبت (۳) مراسمِ عبودیت (۴) دعا' جو عبادت کا جوہر ہے' اور (۵) خلوص و اخلاص' جو قبولیتِ عبادت کی شرط ہے' اور اس کی ضد ہے ریا اور سُمعہ۔

اب ہم اِن پانچ عنوانات کے تحت یہ سمجھیں گے کہ ''شرک فی العبادت'' ہے کیا! اس میں کچھ اشکالات آپ کے ذہنوں میں لامحالہ آئیں گے۔ چونکہ یہ مضامین عام طور پر سامنے نہیں آتے' ہم نے محض چند چیزوں کو متعین کر رکھا ہے کہ بس شرک یہی ہے اور اس

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورة البقرة۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ' باب منه۔

شرک کی ہمہ گیری اور اس کی وسعت اکثر و بیشتر ہمارے سامنے نہیں ہے' لہٰذا جب یہ باتیں سامنے آتی ہیں تو بہر حال انسان چونکتا ہے۔اور اس حوالے سے ایک سوال جو قدم قدم پر سامنے آئے گا وہ یہ ہے کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہر گناہ شرک ہے! لیکن ابھی ذرا اس اشکال' یا اس سوال یا اس اشتباہ کو ایک طرف رکھیے! میں اِن شاءاللہ آخر میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا جواب دوں گا۔ابھی میں جو باتیں کہہ رہا ہوں پہلے ذرا اِن کے دلائل پر توجہ کرتے ہوئے اور ان کے face value پر ان کو سمجھئے کہ وہ صحیح ہیں یا نہیں' دل کو لگتی ہیں یا نہیں۔میں اِن شاءاللہ الجبرا کے فارمولوں کے طریقے پر یہ باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

شرک فی الاطاعت

سب سے پہلی چیز اطاعت ہے۔اب دیکھئے کہ ''شرک فی الاطاعت'' کیا ہے؟ اطاعت کا مفہوم وسیع ہے۔اطاعت اللہ کی بھی ہے' اطاعت اس کے رسول ﷺ کی بھی ہے اور اطاعت اولوالامر کی بھی ہے۔اولوالامر کوئی ایک ہی شخص نہیں ہوتا' بلکہ مسجد میں جو امام یا خطیب ہے وہ وہاں کا والیٔ امر ہے۔کسی بستی کے اندر جو ذمہ دار فرد ہے وہ وہاں کا والیٔ امر ہے۔کسی صوبے کا جو گورنر ہے وہ والیٔ امر ہے۔آپ کا جو سربراہِ ریاست ہے وہ والیٔ امر ہے۔اور نمعلوم کتنے والیانِ امر موجود ہیں۔جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ))(۱) ''تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی''۔چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عورت کو اپنے شوہر کے گھر پر اس کے مال اور اولاد پر اختیار حاصل ہوتا ہے' لہٰذا اُس سے اس کے بارے میں پُرسش ہوگی۔اولاد اپنی والدہ کی اطاعت کرتی ہے' اس کا کہنا مانتی ہے۔اب وہ اپنی اولاد کو اللہ کی اطاعت کی طرف لے گئی ہے یا اللہ کی معصیت کی طرف' اس سے اس بارے میں باز پرس ہوگی۔اسی طرح ایک شخص جو

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب الجمعة فی القری والمدن۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضیلة الامام العادل......

خاندان کا سربراہ ہے، وہ اپنے گھر میں والیٔ امر ہے۔ اُس سے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ وہ انہیں اللہ کی بندگی کی طرف لے گیا ہے یا اللہ کی معصیت اور بغاوت کی طرف۔ تو ہر ایک شخص اپنی اپنی سطح پر والیٔ امر ہے، ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے۔ تو اب اس اطاعت میں اصول کیا ہوگا؟ یعنی بڑوں کی اطاعت، والدین کی اطاعت، اساتذہ کی اطاعت، علماء کی اطاعت، مرشدین کی اطاعت، حکمرانوں کی اطاعت وغیرہ میں ''توحید فی الاطاعت'' کیا ہے اور ''شرک فی الاطاعت'' کیا ہے؟ اسے نبی اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں سمجھئے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ اصول دے دیا گیا ہے کہ:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) (۱)

''کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی اس معاملے میں جس میں خالق کی معصیت لازم آ رہی ہو۔''

مخلوق کی اطاعت کا انکار نہیں ہے، والدین کی اطاعت کرو، بڑوں کی اطاعت کرو، سینئرز کی اطاعت کرو، حکام کی اطاعت کرو، اساتذہ کی اطاعت کرو، اگر دینی اعتبار سے کسی کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کیا ہے تو اس کی اطاعت کرو، لیکن کسی کی اطاعت اللہ کی معصیت میں نہیں ہوگی، کوئی بھی اگر تمہیں اللہ کے حکم کے خلاف حکم دے گا تو اب اُس کی اطاعت نہیں ہوگی۔ وہاں ان کی اطاعت کا دائرہ ختم ہو جائے گا۔ اب ان کی معصیت لازماً کی جائے گی اور اللہ کی معصیت ہرگز نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سپریم ہے، باقی تمام اطاعتیں اُس کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہیں تو یہ ''توحید فی الاطاعت'' ہے۔ اگر کسی ایک اطاعت کو بھی اس دائرے سے باہر نکال کر اللہ کی اطاعت کے ہم پلہ کر لیا گیا تو یہ شرک ہے اور اگر اللہ کی اطاعت سے اوپر لے گئے تو یہ شرک سے بھی زیادہ گھناؤنی بات ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ ہر شخص کا دل اس کی گواہی دے گا اور عقلِ عام اسے تسلیم کرے گی۔

اب ذرا اِس فارمولے کو apply کیجیے اور یہ انتہائی کٹھن مرحلہ ہے۔ اس کے لیے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الجهاد، باب ما جاء لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔

میں ایک مثال خالص انفرادی سطح پر دوں گا اور ایک مثال اجتماعیت کی بلند ترین چوٹی کی دوں گا۔ اور ان دو کے مابین جو مدارج و مراتب ہیں، جو خلا ہے اس کو خود پُر کر لیجیے! خالص انفرادی سطح پر دیکھئے کہ میرا ایک نفس ہے جو مجھے اللہ کے حکم کے خلاف حکم دیتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ......﴾ (یوسف:۵۳)

''اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا، یقیناً نفس تو برائی پر اکساتا ہی ہے''۔

اب اصل مسئلہ میرے لیے ہے، اور وہ یہ کہ ایک طرف اللہ کا حکم ہے اور ایک طرف میرے نفس کا حکم ہے۔ ایک مرضی میرے مولیٰ کی ہے اور ایک خواہش میرے نفس کی ہے۔ میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گیا ہوں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش!

کہ تو نے مجھے ایک تختے پر باندھ کر سمندر کے اندر پھینک دیا ہے، اور تو چاہتا مجھ سے یہ ہے کہ میرا دامن تر نہ ہونے پائے۔ تو انسان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف اس کے ساتھ وہ نفس لگا ہوا ہے جس کے بارے میں خود قرآن یہ کہہ رہا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ اور ساتھ ہی یہ کہا جاتا ہے کہ ع ''ہشدار کہ راہ بر دمِ تیغ است قدم را'' کہ ہوشیار رہو، کہیں تمہارا قدم معصیت کی کسی دلدل کے اندر پھنس نہ جائے! نفس کے ساتھ یہ کشمکش ہر روز، ہر ساعت اور ہر آن ہے۔ فرض کیجیے آپ نے اذان سن لی ہے اور آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ نماز کا بلاوا آ چکا ہے، میرے ربّ کا حکم یہ ہے کہ میں اُس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤں، جبکہ دوسری طرف میرے نفس کا بھرپور تقاضا ہے کہ ابھی سوئے رہو، آرام کرو، یہ چھوڑو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا مطالبہ ہے، پہلا میرا تقاضائے استراحت پورا کرو۔ اب آپ سوچیے کہ آپ نے دو اطاعتوں میں سے کس کو مؤخر کیا اور کس کو مقدم کیا! کس کو اوپر کر دیا اور کس کو نیچے کر دیا! انسان نے کس چیز کو مقدم کرنا ہے اور کس چیز کو مؤخر کرنا ہے (مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ) یہ فیصلہ خود اسے کرنا ہے۔ اور

یہی ہے وہ کٹھن مرحلہ جو انسان کو ہر لحظہ طے کرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا:

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

شرک اور کس بلا کا نام ہے؟ شرک فی الاطاعت اگر کسی شے کا نام ہے تو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہاں نفس کو اللہ کے برابر کر دیا' بلکہ اُس سے بھی اوپر لے گئے۔ اللہ کا حکم تابع ہو گیا ہے نفس کی خواہش کے' اور یہی شرک ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی سند چاہیے تو قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہے: ﴿اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (آیت ۴۳) ''(اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا؟'' اور سورۃ الجاثیۃ میں ہے: ﴿اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ هَوٰىهُ﴾ (آیت ۲۳)۔ قرآن مجید اپنے مطالب و مفاہیم میں بہت واضح ہے' یہ کتابِ مبین ہے۔ اسلام میں داخلے کا نقطۂ آغاز یا بالفاظِ دیگر ''شاہدرہ'' کلمۂ طیبہ ہے: ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' اور مذکورہ بالا آیات میں بھی یہی لفظ ''اِلٰـهَ'' آیا ہے کہ: ﴿اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ هَوٰىهُ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے؟'' زبان سے تو کہہ رہا ہے ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ'' جبکہ اس کا اپنا نفس اور اپنی خواہش الٰہ بنی ہوئی ہے۔

ہم ایک بہت بڑے مغالطے میں مبتلا ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الٰہ اور معبود بس وہی ہے جس کے آگے ہاتھ جوڑ کر آدمی کھڑا ہو' جس کے سامنے سجدہ کیا جا رہا ہو' جس کی ڈنڈوت کی جائے' کوئی چڑھاوا چڑھایا جائے۔ قبروں پر چڑھاوے چڑھائے جائیں تو ہماری رگِ توحیدی پھڑک اٹھتی ہے کہ یہ تو شرک اور کفر ہو رہا ہے! لیکن ہم اپنے نفس کے گلے میں جو ہار ڈالتے رہتے ہیں اور اپنے وجود کے اندر ہی اندر اپنے نفس کے آگے جو دست بستہ کھڑے رہتے ہیں یہ ہمیں نظر نہیں آتا' صرف اس لیے کہ یہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس سے دھوکہ نہ کھایئے' جیسے وہ بُت الٰہ اور معبود ہے جس کو سجدہ کیا جا رہا ہے

ویسے ہی یہ نفس بھی الٰہ اور معبود ہے جس کی خواہش کو اللہ کی مرضی پر مقدم کیا جا رہا ہے۔ یہ نفس بھی مطالبہ کرتا ہے کہ مرضی میری چلے گی' میں نہیں جانتا اللہ کا حکم کیا ہے۔ بالکل وہی انداز ہے جیسے فرعون نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! میں نہیں جانتا اپنے سوا تمہارے لیے کوئی الٰہ۔ یہ تم کس کا نام لے رہے ہو؟ میں مالک ہوں مصر کا' یہاں پر میرا حکم چلے گا۔

مولانا روم جو ترجمانِ حقیقت ہیں[1]' ان کا بڑا پیارا شعر ہے:

نفسِ ما ہم کم تر از فرعون نیست
لیک اُو را عون ایں را عون نیست

یعنی میرا نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ جو اُس نے کہا تھا وہی یہ نفس کہتا رہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کسی اللہ کو' میں نہیں مانتا اس کے حلال اور حرام کو' میں نہیں تسلیم کرتا اس کے کسی حکم کو' بلکہ مرضی میری چلے گی اور تمہیں ماننی پڑے گی' تمہیں میرے حکم کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ بس زبان سے میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس فوج نہیں' لاؤ لشکر نہیں' جبکہ فرعون کے پاس لاؤ لشکر تھا' اس کے پاس بہت بڑا تختِ حکومت تھا' لہٰذا اُس نے زبان سے بھی کہہ دیا تھا: ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ﴿۲۴﴾﴾ (النّٰزعٰت) ''میں ہی تمہارا ربِّ اعلیٰ ہوں''۔

تمام نقلی اور عقلی دلائل سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ رہی ہے کہ تمام اطاعتیں اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تابع ہو جائیں' کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت کے ہم پلہ نہ ہو' اس سے بالاتر نہ ہو تو یہ ''توحید فی الاطاعت'' ہے۔ اور اس کے برعکس جہاں بھی کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مساوی ہو گئی' یا اس سے بھی بالا ہو گئی' تو یہ ''شرک فی الاطاعت'' ہے۔

''شرک فی الاطاعت'' کی اجتماعی صورتیں

اب ذرا اجتماعی سطح پر دیکھیے! اجتماعیاتِ انسانیہ کی بلند ترین سطح ریاست کا تصور ہے'

(۱) مولانا روم کی مثنوی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

''مثنویٔ مولویٔ معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی''

اگرچہ اس میں بہت مبالغہ ہے' اس لیے کہ قرآن مجید کے ہم پلہ تو کوئی چیز نہیں ہو سکتی' لیکن یہ اس معنی میں کہا گیا ہے کہ قرآنی مضامین کو مولانا روم نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

اور یہ تصور حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں حکومت کا تصور تھا' ریاست کا نہیں تھا۔ ریاست تو ایک فرضی (hypothetical) ادارہ تھی' ایک مجرد سی اس کی حیثیت تھی۔ جبکہ حالیہ تصور یہ ہے کہ حکومت اور چیز ہے ریاست اور چیز ہے' اور حکومت کی حیثیت ریاست کو چلانے والی مشینری کی ہے۔ ریاست میں سب سے پہلی چیز جو طے ہوتی ہے وہ حاکمیت کا اصول ہے کہ اس ریاست میں حاکمیت کس کی تسلیم کی جارہی ہے' آخری اختیار کس کے پاس ہے' قانون سازی کا آخری حق کس کے ہاتھ میں ہے؟ اب اس اجتماعی سطح پر توحید یہ ہے کہ: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ ''حکم صرف اللہ کے لیے ہے''۔ حاکمیت کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کے لیے نہیں۔ اس نظریے کی جہاں بھی نفی ہوگی وہ شرک ہے۔ آپ نے حاکمیت کسی اور کے لیے تسلیم کی تو شرک ہوگیا۔ بقول اقبال:

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری

حقائقِ قرآنی کی ترجمانی میں ایک وقت میں جو مقام و مرتبہ مولانا روم کا تھا اِس زمانے میں وہی مقام و مرتبہ علامہ محمد اقبال کا ہے۔ اگرچہ علامہ اقبال کو مولانا روم سے کوئی شخصی نسبت نہیں ہے' اس لیے کہ وہ نہ صرف اپنے فکر میں بہت بلند تھے' بلکہ اپنے عمل میں بھی بہت بلند تھے' جبکہ علامہ اقبال کا عمل کا پہلو بہت کمزور ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو معاف فرمائے' ان کی فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے! لیکن فکر کے اعتبار سے واقعتاً دونوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ فکر کی جس سطح پر مولانا روم تھے اسی سطح پر اِس دَور میں علامہ اقبال ہیں۔ اور انہوں نے کس خوبصورتی سے حاکمیت کے تصور کو بیان کیا ہے! اقبال بار بار کہتے ہیں کہ میں شاعر ہوں ہی نہیں' میں تو شاعری کو صرف ایک ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

آپ دیکھیے یہ کوئی شاعری تو نہیں ہے۔ شاعری تو گل و بلبل کی شاعری ہوتی ہے' کاکل و رخسار اور زلفِ پیچاں کی شاعری ہوتی ہے۔ جبکہ یہاں شاعری ہو رہی ہے:

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری

تو حاکمیتِ اعلیٰ کے اس اصول کو آپ جہاں توڑ دیں گے وہاں شرک ہو جائے گا۔ انسانی حاکمیت (human sovereignty) ہر حال میں شرک ہے' چاہے وہ بادشاہت اور ملوکیت (monarchy) ہو' چاہے جمہوریت (democracy) ہو اور چاہے مذہبی حکومت (theocracy) ہو۔ اگر کوئی فردِ واحد بیٹھا ہے کہ حاکم میں ہوں' میرے ہاتھ میں قانون سازی کا اختیار ہے' میری زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے' تو یہ بدترین شرک ہے۔ یہ تو ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ کی نفی ہوگئی! اسی طرح عوامی حاکمیت (popular sovereignty) بھی بدترین شرک ہے کہ جمہور اختیار کے مدعی بن کر سامنے آجائیں کہ حاکمیت ہماری ہے۔ اس دَور کا سب سے بڑا اور سب سے عام شرک یہی ہے۔ بُت پرستی والے شرک کا دَور گزر گیا ہے۔ اب ہندوستان میں بھی شاید ایک دو فیصد لوگ ہی ہوں جو بُتوں کی ڈنڈوَت کرتے ہوں' اب جو شرک ہیں وہ بالکل دوسرے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر دَور میں شرک جو بھی نیا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے اس کو انسان سمجھے۔ بقولِ اقبال:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

جب آدمی کو ذرا شعور حاصل ہوا تو اُس نے فردِ واحد کی حکومت کو ماننے سے انکار کر دیا اور عوامی حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ دینی اعتبار سے بات وہی ہے' وہ بھی شرک ہے اور یہ بھی شرک ہے۔

اسی طرح مذہبی حکومت یا پاپائیت (theocracy) کا نظریہ بھی شرک ہے' جس میں کوئی مذہبی طبقہ اپنے ہاتھ میں اختیار لے کر بیٹھ جاتا ہے کہ وہ جو چاہے قانون بنا دے۔ یورپ میں جو پاپائیت کا نظام رائج رہا ہے وہ بدترین شرک ہے۔ قرآن مجید نے اس پر بہت بڑی فردِ جرم عائد کی ہے کہ: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

(التوبۃ: ۳۱) ''انہوں نے اپنے علماء اور صوفیوں کو اللہ کے علاوہ اَرباب بنالیا ہے''۔ یعنی ان کو معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتم ؓ عیسائیت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے' اس آیت کے بارے میں انہوں نے بڑے ادب سے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی کہ حضور ﷺ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی' میں عیسائی رہا ہوں اور ہم نے اپنے احبار اور رُہبان کو خدا نہیں بنایا۔ یہ ایک بہت بڑا اشتباہ تھا کہ قرآن مجید عیسائیت پر اتنا بڑا چارج لگا رہا ہے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَمَا اِنَّھُمْ لَمْ یَکُوْنُوْا یَعْبُدُوْنَھُمْ وَلٰـکِنَّھُمْ کَانُوْا اِذَا اَحَلُّوْا لَھُمْ شَیْئًا اسْتَحَلُّوْہُ وَاِذَا حَرَّمُوْا عَلَیْھِمْ شَیْئًا حَرَّمُوْہُ)) (۱)

''کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ (عیسائی) ان (اَحبار و رُہبان) کی بندگی تو نہیں کرتے تھے مگر وہ ان کے لیے جب کوئی چیز حلال ٹھہراتے تو وہ اسے حلال سمجھ بیٹھتے تھے اور وہ ان پر جب کوئی چیز حرام قرار دیتے تو وہ اُسے حرام سمجھ بیٹھتے تھے؟''

اس لیے کہ شریعتِ موسوی تو ختم ہو گئی تھی' اب قانون کا حق پوپ کے ہاتھ میں اور اس کے نمائندوں کے ہاتھ میں تھا کہ وہ جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام ٹھہرا دیں۔ تو جس کے ہاتھ میں یہ اختیار آ گیا وہی تو خدا ہے۔ لہٰذا بادشاہت و ملوکیت' مذہبی حاکمیت اور جمہوریت تینوں ہی شرک کی شکلیں ہیں۔

آج جمہوریت اور عوام کی حاکمیت کا دَور ہے۔ اور جیسے بادشاہ کی حاکمیت اور مذہبی راہنما یا مذہبی طبقہ کی حاکمیت شرک ہے اسی طرح یہ بھی اجتماعی سطح پر شرک ہے۔ ہاں اگر بادشاہ خود بھی اللہ کے قانون کا پابند ہو' اور اللہ ہی کے قانون کو نافذ کر رہا ہو تو یہ شرک نہیں ہے۔ حضراتِ داؤد اور سلیمان علیہما السلام یقیناً شرک کرنے والے نہیں تھے' جبکہ نمرود اور فرعون شرک کرنے والے تھے۔ اسی طرح مذہبی طبقہ اگر اپنی مرضی سے نہیں بلکہ قرآن مجید (یا اپنے اپنے دَور میں تورات' انجیل' زبور) کے مطابق حکم دے رہا ہو اور اس کے ہاتھ میں انتظامی اختیارات ہوں تو یہ شرک نہیں ہو گا۔ یہ خدائی حاکمیت کے تصور کے تحت ایک مذہبی

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورۃ التوبۃ۔

حکومت ہو جائے گی کہ اختیارِ مطلق اللہ کا ہے' لیکن انتظامی امور مذہبی طبقے کے ہاتھ میں ہیں۔ حضرت طالوت سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نظام رہا ہے وہ اسی نوعیت کا نظام تھا۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ:

((کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ)) (۱)

''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے''۔

چنانچہ ایک جمہوریت اگر یہ طے کر لے کہ اصل تشریع کا حق اللہ کا ہے اور جو بھی پارلیمنٹ یا کانگریس ہے اس کے اختیارات کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر محدود ہیں تو وہ جمہوریت اب شرک نہیں ہو گی' لیکن مطلق جمہوریت' مطلق بادشاہت و ملوکیت' مطلق تھیوکریسی شرک ہے۔ تو ابتدا سے لے کر انتہا تک اصول یہی ہے کہ مطلق اطاعت صرف اللہ کا حق ہے' باقی سب کی اطاعت مشروط ہو گی اللہ کی اطاعت سے۔ یہ ہے ''توحید فی الاطاعت'' اور اس کو جہاں بھی مجروح کر دیا جائے گا وہ شرک کی کوئی شکل بن جائے گی' چاہے وہ خالص انفرادی سطح پر نفس پرستی ہو یا اجتماعی سطح پر حاکمیتِ غیر اللہ کا کوئی بھی تصور ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت کا تصور بہرطور شرک ہو جائے گا۔

شرک فی المحبت

عبادت میں دوسری لازمی چیز ''محبت'' ہے۔ اب دیکھئے ''شرک فی المحبت'' کیا ہے اور ''توحید فی المحبت'' کیا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کا بیسواں رکوع اس موضوع پر کلائمکس ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو (اس کے) مدّ مقابل بنا لیتے ہیں' وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہونی چاہیے''۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورۃ التوبۃ۔

یہاں ’’شرک فی المحبت‘‘ کا ذکر بھی آ گیا ہے اور ’’توحید فی المحبت‘‘ کا بیان بھی ہو گیا ہے۔یعنی اگر کوئی ہستی یا کوئی ادارہ اتنا محبوب ہو جائے جتنا اللہ محبوب ہے‘ تو یہ ’’شرک فی المحبت‘‘ ہے۔اسی طرح محبت کے اندر توحید کیا ہے؟ فرمایا گیا:﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ﴾ ’’اور جولوگ واقعتاً ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت ہیں اللہ کی محبت میں‘‘۔ یعنی ان کی ساری محبتوں پر غالب محبت اللہ کی ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل امتحان ہی محبت کا امتحان تھا اور آپؑ سارے امتحانات میں پاس ہو گئے تھے۔والدین کی محبت کو انہوں نے اللہ کی محبت پر قربان کر دیا اور توحید کی خاطر والدین کے گھر کو چھوڑ دیا۔اپنی قوم کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کر دیا۔وطن کو چھوڑ کر وطن کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کر دیا۔جیسے انہوں نے فرمایا تھا:

﴿اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ ﴿۹۹﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

’’یقیناً میں تو اب اپنے ربّ کی طرف جا رہا ہوں‘ عنقریب وہ مجھے راہ یاب کر دے گا‘‘۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری آزمائش بیٹے کی محبت کی تھی۔اور بیٹا بھی اکلوتا‘ جو ستاسی برس کی عمر میں دعائیں مانگ مانگ کر ملا‘ اور انتہائی حلیم الطبع بیٹا‘ جس کے رُوئیں رُوئیں سے سعادت مندی اور نیکی پھوٹ رہی تھی۔ذرا اندازہ کیجیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اُس کے لیے کتنی محبت ہوگی! اب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آخری امتحان لیا کہ بیٹے کی محبت کہیں ہماری محبت سے بالاتر تو نہیں ہوگئی؟ ابراہیم! اسے بھی اگر تم ہمارے لیے‘ ہمارے حکم کے تحت ذبح کر سکتے ہو تب تو واقعتاً تم موحّد فی المحبت ہو گئے‘ اللہ کی محبت میں توحید کا مقام تم نے حاصل کر لیا‘ اور اگر یہاں ناکام ہو گئے تو جان لو کہ توحید کے امتحان میں ناکام ہو گئے۔پھر تو معلوم ہوا کہ ایک محبت ابھی ایسی ہے جو دل کے سنگھاسن پر اللہ کی محبت کے برابر بیٹھی ہے یا اس سے بھی بالاتر ہو گئی ہے۔یہ آخری امتحان تھا محبت کا‘ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سرخرو ہو گئے— اور یہ ہے ’’توحید فی المحبت‘‘۔

’’شرک فی المحبت‘‘ کی دلیل کے لیے بھی دو آیات پیش کی جا رہی ہیں۔ایک تو وہ

آیت جس کا ہم نے ابھی مطالعہ کیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ﴾ (البقرۃ:١٦٥)

’’اور لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو (اس کے) مدّ مقابل بنا کر اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت کرنی چاہیے‘‘۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (التوبۃ)

’’(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ‘ اپنے بیٹے‘ اپنے بھائی‘ اپنی بیویاں‘ اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے جمع کیے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جن کی کساد بازاری کا تمہیں خوف رہتا ہے اور اپنے وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں (جنہیں تم نے بہت شوق اور ارمانوں سے بنایا ہے) زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو (دفع ہو جاؤ) یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سامنے لے آئے۔اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔

اس لیے کہ یہ مشرک ہیں‘ یہ ’’شرک فی المحبت‘‘ کے اندر مبتلا ہیں۔انہیں یہ آٹھ چیزیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں۔

اب ذرا اس اصول کو الجبرا کے فارمولے کی طرح عملی زندگی میں apply کیجیے!

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی

﴿أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ﴾ (النساء:١٣٥)

"اے اہل ایمان! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ وہ (انصاف کی بات اور گواہی) تمہارے اپنے خلاف یا والدین اور رشتہ داروں کے خلاف جاتی ہو"۔

آپ اپنے گروہی اور فرقہ وارانہ تصورات لیے بیٹھے ہیں' ان پر ذرا سی آنچ آتی ہے تو آپ تلملا اٹھتے ہیں۔ اگر آپ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ شرک سے بچے ہوئے آپ بھی نہیں ہیں تو بہرحال غصہ تو آئے گا۔ لیکن ذرا غور تو کیجیے اور حقیقت کو سمجھئے' دوسروں پر شرک کے فتوے جڑ دینا آسان ہے' دوسرے کی آنکھ کے اندر تنکا بھی نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید سے سمجھئے کہ "شرک فی المحبت" کیا ہے۔

مال سے انسان کو بہت محبت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے۔ اسے آپ ﷺ کی بددعا بھی کہا جا سکتا ہے اور خبریہ کلام بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) (۱) "ہلاک ہو جائے (یا ہلاک ہوا) درہم و دینار کا بندہ۔"

دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے یہاں "عبد" کا لفظ استعمال کیا ہے' جیسے سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ اور الجاثیۃ کی آیت ۲۳ میں "اِلٰہ" کا لفظ لایا گیا ہے' تاکہ کوئی اشکال اور اشتباہ باقی نہ رہے' اِدھر اُدھر سے بچ نکلنے کا کوئی موقع نہ رہے۔ جسے مال بہت محبوب ہے اسے آپ ﷺ نے عبدالدرہم اور عبدالدینار کہا ہے۔ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ بس مال آنا چاہیے' چاہے حلال سے آئے یا حرام سے آئے۔ اب اگر آپ کے دل میں مال کی محبت اِس قدر ہے تو آپ کا محبوب اور معبود مال ہوا۔ اس لیے کہ جو چیز محبوب ہے وہی معبود ہے۔ اب آپ کے معبود دو ہو گئے۔ آپ اللہ کے لیے بھی سجدے کرتے ہیں اور مال بھی آپ کا معبود ہے' اگرچہ آپ لکشمی دیوی کو نہیں پوجتے' خود اس کے پجاری بھی اس لکشمی کو نہیں پوجتے' بلکہ دولت کو پوجتے ہیں' لکشمی تو درحقیقت اُن کے ہاں ایک علامت ہے' پجاری تو اصل میں وہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله۔

دولت کے ہیں۔ اسی طرح ہم نے بھی اگرچہ لکشمی کو دیوی قرار دے کر اس کی مورتی نہیں بنائی لیکن اس کی پوجا کا جو اصل مقصود ہے وہ تو ہم کر رہے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "ہلاک ہو گیا (یا ہلاک ہو جائے) درہم و دینار کا بندہ"۔ اب چاہے اس نے اپنا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن رکھا ہو لیکن اس کی اصل اور معنوی شخصیت عبدالدینار اور عبدالدرہم کی ہے۔ یہ خالص انفرادی سطح کی بات ہے اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ یہ بات فرما رہے ہیں۔

اجتماعی سطح پر "شرک فی المحبت" کی صورت

اجتماعی سطح پر دیکھئے کہ "توحید فی المحبت" کیا ہے اور "شرک فی المحبت" کیا ہے۔ اس دَور کے جو اجتماعی تصورات ہیں ان میں ایک تصور وطن کی بنیاد پر قوم پرستی (nationalism) کا ہے۔ پچھلے زمانے کی قوم پرستی اکثر و بیشتر نسل کی بنیاد پر ہوتی تھی اور جو تصادم ہوتا تھا وہ بھی نسلی بنیاد پر ہوتا تھا' جبکہ انیسویں اور بیسویں صدی کا جو سب سے بڑا سیاسی تصور یورپ نے دیا ہے وہ وطنی قوم پرستی کا تصور ہے کہ ایک وطن کے اندر رہنے والے سب ایک قوم ہیں اور مذہب ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہے' چاہے کوئی ہندو ہو' سکھ ہو' پارسی ہو' عیسائی ہو' اس سے حکومت کو بحث نہیں ہے۔ ریاست سیکولر ہے' ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں جو بھی اس حدود کے اندر رہنے والے ہیں ان کو قومیت (nationality) مل جائے گی کہ وہ اس وطن کے رہنے والے ہیں اور اس ریاست کے شہری ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہر اجتماعیت کو لازماً کوئی چیز ایسی چاہیے جو مرکزِ محبت بن جائے۔ اس لیے کہ اگر کسی چیز کے ساتھ جذباتی لگاؤ نہیں ہو گا تو اس کے ساتھ کیسے جڑیں گے' کیسے بنیانِ مرصوص بنیں گے' خطرات کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ لہٰذا اِس دَور میں جو اصل معبود تراشا گیا ہے وہ وطن ہے۔ وطن کی محبت اور عظمت کے گن گائے جاتے ہیں' وطن کی آن پر کٹ مرنے کا درس دیا جاتا ہے' وطن کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ وطن کے جھنڈے کے سامنے باادب کھڑے ہو کر اسے سلامی دی جاتی ہے۔ وطن کا ایک ترانہ حمد بھی ہوتا ہے جس کو قومی ترانہ کہا جاتا ہے۔ یہ مذہبِ وطنیت ہے جس کے یہ مراسمِ عبودیت ہیں۔ یہ اِس دَور کا نیا شرک ہے اور اس کو ہمارے علماء میں سے کوئی نہیں سمجھ پایا۔ میں علامہ اقبال کی

عظمتِ فکر کا اسی لیے قائل ہوں کہ اِس حقیقت کو سمجھنے والے اِس دَور میں صرف علامہ اقبال تھے۔ جس طرح انہوں نے حاکمیتِ اعلیٰ کے نظریے کو واضح کیا ہے' اسی طرح انہوں نے ''وطنیت'' کے بُت پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اِس دَور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کے جذبے اور احساس کی شدت کا عالم دیکھئے! اس لیے کہ اُن کا مشاہدہ بہت گہرا تھا' انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ کتنا پانی دریائے راوی کے پل کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ اب لات' منات' عزیٰ اور ہبل کی پوجا کا زمانہ گزر چکا ہے' اِن بُتوں کے پجاری آج نہیں ملیں گے' آج پوجا کسی اور شے کی ہو رہی ہے' اور اس جگہ پر سب سے بڑا بُت وطن ہے۔ اب ہمارے ہاں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اِن چیزوں کی حقیقت پر غور نہیں کیا۔ یہ جھنڈے کی سلامی چہ معنی دارد؟ یہ دراصل وطن کے مراسمِ عبودیت میں سے ہے کہ جب قومی ترانہ گایا جا رہا ہو تو آپ جھنڈے کے سامنے ساکت و صامت کھڑے ہو جائیں۔ یہ گویا وطن کی نماز ہے جو پڑھی جا رہی ہے اور ہم نے اسے سمجھا نہیں ہے۔ ہر مذہب میں اپنے معبود کے ساتھ محبت کے اظہار اور اُس کی عظمت کے اقرار کے لیے کچھ شکلیں اختیار کی جاتی ہیں' اسی طرح وطن کی محبت کے اظہار اور اس کی عظمت کے اقرار کے لیے اس کے جھنڈے کو عاجزی کے ساتھ سلامی دی جاتی ہے۔ یہ مذہبِ وطنیت جو یورپ کا ایجاد کردہ تھا' اس کی تمام مذہبی رسومات (rituals) کو ہم نے جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔ یہ اُس مذہب کی رسومات ہیں جس کا معبود وطن ہے۔ اس کے بارے میں اقبال نے مزید کہا ہے:

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ﷺ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی خاک میں اِس بُت کو ملا دے!

وطن کے اس بُت کو خاک میں ملا دینا علامہ اقبال کا پیغام ہے۔ دیکھئے وطن آپ کا معبود کیسے ہوا؟ اس لیے کہ آپ کی محبت کا مرکز وطن بن گیا ہے۔ اب آپ کے نزدیک جو شے وطن کے لیے اچھی ہے وہ اچھی ہے' چاہے فی نفسہٖ وہ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ وطن کے لیے آپ کو دوسروں پر ظلم کرنا پڑ رہا ہے تو آپ کر رہے ہیں۔ اپنے وطن کی جے بولی جا رہی ہے۔ کبھی اعلیٰ ہبل کے نعرے لگا کرتے تھے' لیکن اب وطن کے نعرے ہیں۔ اس زمین نے درحقیقت آج دیوتا کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی بنیاد میں قومیت کا تصور ہے جو آج کے اجتماعی تصورات میں اہم ترین تصور ہے۔

بہرحال ''توحید فی المحبت'' یہ ہے کہ محبت کا اصل مرکز ذاتِ باری تعالیٰ ہو' تمام محبتیں اس کے تابع ہو جائیں —— اور ''شرک فی المحبت'' یہ ہے کہ کسی شخص یا کسی ادارے یا کسی شے کی محبت اللہ کی محبت کے ہم پلہ ہو جائے یا اس سے بالاتر ہو جائے۔

چند ضروری وضاحتیں

''حقیقت واقسامِ شرک'' کے اِس مفصل سلسلۂ گفتگو کے تحت گزشتہ نشست میں ہم نے شرک کی معین کردہ اقسام میں سے تیسری اور آخری قسم ''شرک فی الحقوق'' یا بالفاظِ دیگر ''شرک فی العبادت'' پر گفتگو کی تھی اور ''عبادت'' کے دو اجزائے ترکیبی ''اطاعت'' اور ''محبت'' کے حوالے سے مَیں نے اصولی اور بنیادی باتیں بیان کر دی تھیں۔ اِس ضمن میں انفرادیت سے لے کر اجتماعیت کی بلند ترین چوٹی یعنی ''ریاست'' کی الگ الگ مثالیں بیان کرنے کے بعد عرض کیا گیا تھا کہ انہی پر قیاس کرتے ہوئے درمیانی خلاء کو آپ خود پُر کر لیجیے۔ لیکن حاضرین کی جانب سے بعض سوالات کی بنا پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس موضوع پر بعض باتوں کی مزید وضاحت ضروری اور سودمند ہے۔

کیا تقلید شرک ہے؟

اطاعت کے ضمن میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ قرآن مجید نے اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۳۱) اور اس ضمن میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی جو تشریح فرمائی تھی وہ بھی بیان کی جا چکی ہے۔ اب اسی کو سامنے رکھ کر ہمارے ہاں جو تقلید کا ایک تصور ہے اس کو سمجھ لیجیے!

دیکھئے تقلید کا ایک تصور ہے ''عوام'' کے نزدیک اور ایک تصور ہے ''اہلِ علم'' کے نزدیک۔ اِن دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ عوام کے ذہنوں میں تقلید کا جو تصور ہے وہ بالعموم شرک ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ بات ہے کہ جو بات امام ابوحنیفہؒ کہہ دیں وہ ہم لازماً مانیں گے، بغیر کوئی دلیل طلب کیے کہ وہ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں اور کتاب وسنت کی کون سی دلیل اُن کے پاس ہے، تو یہ شرک ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بات مجرد اس لیے مان لی جائے کہ یہ امام احمد بن حنبل یا امام شافعی یا امام مالک رحمہم اللہ کی زبانِ

مبارک سے نکلی ہوئی بات ہے تو یہ بلاشک وشبہ شرک ہے۔ البتہ ہمارے ہاں اہل علم کے نزدیک تقلید کا تصور یہ ہے کہ جن عظیم اور باہمت لوگوں نے کتاب وسنت کا فہم حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپائی ہیں اُن کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے، اور انہوں نے کتاب وسنت سے استنباط کر کے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کو مدّنظر رکھ کر اُن کی رائے پر عمل کیا جائے۔ اس ضمن میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول موجود ہے کہ ''اگر تمہیں میرے کسی قول کے خلاف صحیح حدیث نبوی ﷺ مل جائے تو میری بات کو دیوار پر دے مارو''۔ اس لیے کہ کسی بات میں وزن محض اس وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ یہ فلاں شخص کی بات ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اُس نے کتاب وسنت سے اپنی بات کو مدلل کیا ہے اور کتاب وسنت کے منشاء کو سمجھ کر اس سے استنباط کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اوّلین شاگردوں قاضی ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کیا ہے اور آج دنیا میں جو فقہ حنفی موجود ہے وہ اکثر وبیشتر امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر نہیں ہے بلکہ صاحبین یعنی قاضی ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے پر ہے۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ''مزارعت'' مطلقاً حرام ہے، لیکن فقہ حنفی میں اس پر جو فتویٰ ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر نہیں ہے بلکہ صاحبین کی رائے پر ہے۔ تو اُن کے شاگردوں نے اُن سے اختلاف کیا ہے۔ ہمارے ہاں جب تک تقلید کے معاملے میں یہی طرزِ عمل رہا تو ایک صحت مند فضا رہی۔ اس کے بعد ایک دَور آیا کہ علماء نے اس خطرے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اب علم کی کمی ہو گئی ہے، حرص وہوا کا زور ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اجتہاد میں خطرات زیادہ ہیں، یہ کہا کہ اب نئے اجتہاد کی بجائے علماءِ سلف کے اجتہاد پر ہی عمل کیا جائے۔ تو یہ ایک احتیاط ہے جو اِس دَور میں علماء نے اختیار کی ہے۔ لیکن اس میں بھی اہل علم کے نزدیک کوئی شخص اپنی ذات میں مُطاع ہرگز نہیں ہے، بلکہ کتاب و سنت کی بنیاد پر ہی اس کی بات مانی جائے گی۔ چنانچہ یہ تقلید شرک نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کو اپنی ذات میں مُطاع مان لیا جائے تو اس قسم کی تقلید شرک ہے اور یہ اُسی قسم کا شرک ہے جیسا کہ قرآن مجید نے اہل کتاب کے بارے میں کہا کہ:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ﴾ (التوبة: ۳۱)

''انہوں نے (یعنی یہود ونصاریٰ نے) اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور صوفیوں کو ربّ بنا لیا''۔

اس لیے کہ دو ہی طبقے مذہبی ہوتے ہیں' علماء اور صوفیاء۔ ہمارے ہاں بھی تصوف کے میدان میں یہ گمراہ کن تصور موجود ہے کہ مرشد کو اپنی ذات میں مُطاع مان لیا گیا ہے۔ اس میدان میں شاعری کے ذریعے بہت فتور اور گمراہی پھیلی ہے اور اس طرح کی باتیں زبان زدِ عوام وخواص ہوگئی ہیں کہ ع ''بہ مَے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید!'' یعنی ''اگر تمہارا مرشد تم سے کہے کہ تم اپنی جانماز کو شراب سے رنگین کر دو تو کر دیا کرو''۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تصور خالص شرک ہے۔ کوئی چاہے مرشد ہو' عالم ہو' حاکم ہو' مجتہد ہو' کسی کی بات بھی اگر مانی جائے گی تو کتاب وسنت کے دائرے کے اندر اندر مانی جائے گی اور قرآن وحدیث کی دلیل سے مانی جائے گی۔ اگر طرزِ عمل یہی ہے تو یہ توحید ہے۔ اور اگر اس کو کہیں سے بھی اور کسی پہلو سے بھی مجروح کر دیا جائے تو یہ شرک ہے۔

محبت اور پرستش میں فرق

اب آیئے ''محبت'' کے معاملے میں جو عملی پہلو ہیں اُن پر غور کر لیا جائے۔ جان لیجیے کہ ''محبت'' اور چیز ہے اور ''پرستش'' اور چیز ہے۔[1] چنانچہ وطن کی محبت اور چیز ہے اور وطن پرستی اور چیز ہے۔ وطن سے محبت اپنی جگہ ایک مطلوب اور قابلِ قدر جذبہ ہے۔ جسے وطن سے محبت نہ ہو وہ شخص بڑا بے غیرت ہے۔ جسے والدین سے محبت نہ ہو تو وہ شخص بڑا بے حمیت ہے۔ اپنے قبیلے اور قوم سے محبت نہ ہو تو ایسا شخص بے غیرت اور بے حمیت ہے۔ اب اگر یہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع رہیں اور اللہ کی محبت ان سب کے اوپر ہو تو یہ ''توحید فی المحبت'' ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک محبت بھی اللہ کی محبت سے بالاتر ہو جائے یا برابر بھی ہو جائے تو وہ ''شرک فی المحبت'' ہے۔

(۱) ماسوی اللہ کے لیے لفظ ''عبادت'' کے بجائے لفظ ''پرستش'' استعمال ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک طرح کی دیانت ہے۔

اسی طرح سے ایک اور پرستش ہے ''شخصیت پرستی''۔ یہ بھی کوئی کم درجے کا شرک نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی محبت اور عقیدت آپ کو اندھا اور بہرا کر دے اور اس کی ہر بات آپ کے لیے سند ہو' اس کی رضا جوئی ہی آپ کے پیشِ نظر رہے تو یہ شخصیت پرستی ہے اور یہ یقیناً شرک ہے۔ یہی بات نبی اکرم ﷺ نے فرمائی ہے کہ: ((حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ))[1] ''تیرا کسی شے سے محبت کرنا تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے''۔ یہی محبت آج شخصیت پرستی کی شکل میں دنیا میں رائج ہے۔ اور قابل غور بات ہے کہ اس کو باقاعدہ ایک سیاسی تصور (political concept) کی حیثیت سے دنیا میں develop کیا گیا ہے۔ گاندھی جی کے اسّی اسّی گز اونچے مجسمے کوئی مشغلے (hobby) کے طور پر نہیں تراشے گئے تھے' بلکہ اس وجہ سے تراشے گئے تھے کہ اس شخص کی عظمت لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہو جائے اور اُس سے محبت اور عقیدت رکھنے والے سب ایک دوسرے سے جڑے رہیں' جس طرح کہ وطن کی محبت اہل وطن کو مستحکم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والی شے (unifying force) ہے۔ یہ شخصیت پرستی دنیا میں پہلے بھی ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی ہے۔ اس کو hero worship کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں مسلم لیگ کے زعماء میں سے ایک صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ کبھی نماز کے قریب تو پھٹکے نہیں تھے' لیکن اُن کا اپنا کہنا یہ تھا کہ ''میں تو صبح ہی صبح قائداعظم کی تصویر کو سلام کرتا ہوں اور بس یہی میری نماز ہے''۔ اب یہ شخصیت پرستی (hero worship) نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر کوئی غیر یہ بات کرے تو ہم کہتے ہیں وہ بُت پرست ہے اور ہم ایسی بات کر کے بھی سمجھتے ہیں کہ ہم تو موحّدِ کامل ہیں اور اس سے ہماری توحید میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔ ایسے ہی سٹالن کے مجسمے نصب کیے گئے اور اس کی تصویریں بچوں کے ذہنوں کے اندر اتاری گئیں' تاکہ اس کی محبت اور عقیدت ذہنوں پر چھا جائے۔ اسی طرح ماؤزے تنگ کے بُت تراشے گئے۔ تو یہ سب انسان پرستی اور شخصیت پرستی ہے۔ اور یہ ختم نہیں ہوئی' آج بھی اس کا وجود باقی ہے۔

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی الھوی۔

آج کے زمانے میں ایک اور محبت ''نظریے کی محبت'' ہے۔ اگر کسی تصور یا نظریے کی محبت' چاہے وہ اشتراکیت کا نظریہ ہو یا کوئی اور انقلابی نظریہ ہو' انسان کے ذہن پر اس طرح غالب اور مستولی ہو جائے کہ اُس کا جینا اور مرنا اللہ تعالیٰ کے بجائے اُس نظریے کے لیے ہو جائے تو' معاذ اللہ' یہ اُس نظریے کی پرستش ہے۔ گویا ایک نظریے اور ایک نظام کو پوجا جا رہا ہے۔ کسی نے بڑا پیارا شعر کہا ہے:

اِک تصور کے حسنِ مبہم پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے!

انسان کے اندر جب تک کوئی آرزو نہ ہو' کوئی آدرش نہ ہو' کوئی نصب العین نہ ہو تو جینے کا مزا ہی کیا ہے! پھر تو وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے' اُس کی زندگی محض سانسوں میں ڈھالی ہوئی زندگی ہے' وہ محض human vegetable ہے۔ لیکن نصب العین صرف ایک ہی صحیح ہے' اور وہ ''اللہ کی محبت'' کا نصب العین ہے۔ جب کوئی اور نصب العین اس جگہ پر آ کر منطبق ہو گیا تو یہی تو شرک ہے۔ جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرة:١٦٥)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو (اُس کے) مدّمقابل بنا لیتے ہیں' وہ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہونی چاہیے۔ اور جو لوگ واقعتاً ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت ہیں اللہ کی محبت میں''۔

مَیں یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ ''وطنیت کا نظریہ'' اس دَور کے بہت بڑے شرک کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا ہے' لیکن ہمارا کوئی بھی عالمِ دین اس کو نہیں سمجھ سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے علماء نے بدقسمتی سے مغرب کے فلسفے کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ اپنے تصورات کے پیشِ نظر یہ سمجھتے رہے کہ وطنیت (nationalism) شاید حبّ الوطنی ہے! لیکن اس دَور میں علامہ اقبال نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ ان کا بڑا

پیارا شعر ہے:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!

یعنی میں جدید تہذیب و تمدن اور جدید عمرانی نظریات کی آگ میں ڈالا گیا ہوں' جیسے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مغرب کے اِن نظریات اور فلسفے کے پس پردہ کیا کچھ ہے جو اِس اجتماعی زندگی کی بنیاد بنے ہیں' اور مسلمان اُمت کو اِس سے آگاہ کرنا اور ان کا ردّ کرنا میرا امتحان ہے۔ علامہ اقبال کو اس چیز کا براہِ راست مشاہدہ تھا' جبکہ ہمارے علماء اس کو نہیں سمجھ سکے۔ یہ کتاب وسنت کے علم سے خوب واقف ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ علم دین کے اعتبار سے ہمارے علماء کی شخصیتیں منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم جیسی ہیں' لیکن جب تک یہ علم اِس دَور کی زمین تک نہ پہنچے تو وہ ڈیم میں کھڑے اُس پانی کی مانند ہے جو تب ہی فائدہ مند ہوتا ہے جب وہ زمین تک پہنچے۔ اس اہم کام کے لیے تقسیم کے ذرائع (distribution channels) درکار ہیں جو اِس علم کو آگے پہنچائیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ چینلز آج نہیں رہے۔ رابطے کا ایک خلاء (gap of communication) بیچ میں حائل ہے کہ بات آگے پہنچ نہیں پا رہی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اِس دَور کے نظریات کو سمجھا جائے۔ اس لیے کہ اِس دَور کا شرک تب ہی سمجھ میں آئے گا جب گہرائی میں اُتر کر اس دَور کے نظریات کو سمجھا جائے۔ یہ بات اگرچہ چھوٹی اور غیر اہم محسوس ہوتی ہے لیکن بعض بظاہر چھوٹی باتیں تِل کے اوٹ میں پہاڑ کی مانند ہوتی ہیں۔

ایک صاحب نے جھنڈے کی عظمت اور اس کے وقار کو بچانے کی بات کی ہے۔ یہ بات اپنی حد تک درست بلکہ ضروری ہے' لیکن جھنڈے کو دیکھ کر کھڑے ہو جانا' اسے سلامی دینا' یہ ثابت کیجیے محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے! یہ تو **قنوت للعَلَم** ہے کہ آپ جھنڈے کے آگے ہاتھ باندھ کر باادب کھڑے ہو جائیں۔ یہ میرے نزدیک شرک ہے' ورنہ جھنڈے کی عظمت اور وقار کو بچانا اپنی جگہ مسلّم ہے۔ جیسے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ اُحد میں اپنی

جان کی قربانی دے دی لیکن جھنڈے کو نہیں گرنے دیا۔ ایسے ہی حضرت زید بن حارثہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہما نے کیا۔ لیکن جھنڈے کو سلامی دینا اور اس کے لیے خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہو جانا قطعاً جائز نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے تو اپنے لیے کھڑا ہونے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منع فرما دیا تھا۔ حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے تشریف لانے پر آپ ﷺ کے لیے احتراماً کھڑے ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُوْا كَمَا تَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ يُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا))(۱)

''تم لوگ (میرے تشریف لانے پر) کھڑے نہ ہو جایا کرو جیسے کہ عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

تو ''حبّ الوطنی'' اور چیز ہے اور ''وطن پرستی'' اور چیز ہے۔ اِن دونوں چیزوں میں جب تک فرق نہیں کریں گے اور ان کو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھیں گے تو ذہنوں میں لازماً اشکال پیدا ہو جائیں گے۔

''مراسمِ عبودیت'' صرف اللہ کے لیے ہیں

عبادت کا تیسرا جزو ہے ''مراسمِ عبودیت''۔ رکوع کرنا' سجدہ کرنا' کسی کے لیے مؤدب ہو کر کھڑے ہونا' نذر پیش کرنا اور نذر ماننا یہ سب مراسمِ عبودیت ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے روا ہیں۔ اگر کوئی غیر اللہ کے لیے یہ مراسمِ عبودیت انجام دیتا ہے تو یقیناً غلطی پر ہے اور اس کا یہ عمل شرک ہے' چاہے اُس کی نیت شرک کی نہ ہو۔ اس لیے کہ اُس کے اِس عمل سے نمعلوم کتنے لوگ گمراہ ہو جائیں۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر جب دین کی تکمیل ہوئی تو سجدۂ تعظیمی بھی حرام قرار دے دیا گیا' حالانکہ اس سے پہلے سجدۂ تعظیمی جائز تھا۔ کسی کے ادب اور تعظیم کے لیے اُس سے جھک کر ملنا انسان کی فطرت اور جبلت میں ہے۔ کوئی کسی بزرگ سے جب ملتا ہے تو ذرا جھک جاتا ہے۔ پچھلے زمانے میں یہ جھکنا رکوع کی حد تک اور

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی قیام الرجل للرجل۔

اُس سے بھی آگے بڑھ کر سجدے کی حد تک چلا جاتا تھا' اور کسی کے سامنے تعظیماً رکوع اور سجدہ کرنا' بغیر اس عقیدے اور تصور کے کہ اُس میں کوئی الوہیت یا خدائی اختیارات ہیں' ممنوع اور حرام نہیں تھا۔ لیکن جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ہدایتِ ربّانی کی تکمیل ہوئی تو وہ تمام دروازے بند کر دیے گئے جہاں سے یہ گمراہی اور بیماری نقب لگا کر اِس اُمت میں دَر آ سکتی تھی۔ لہٰذا اس سجدۂ تعظیمی کو مستقلاً حرام قرار دے دیا گیا کہ اب کسی نیت سے بھی غیر اللہ کو سجدہ نہیں ہوگا' یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

اس معاملے میں حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت عظمت کا ایک روشن مینار ہے۔ آپؒ حالانکہ صوفیاء کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہیں' تصوف کے میدان کے مجدّد ہیں' آپؒ کا اصل تجدیدی کارنامہ تصوف کے میدان ہی میں ہے' لیکن یہ شخص سجدۂ تعظیمی کے باب میں حکومتِ وقت سے ٹکرا گیا۔ بقول اقبالؔ:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

واقعہ یوں ہے کہ سجدۂ تعظیمی مغل دربار کے اندر رائج تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے فتویٰ دیا کہ یہ ناجائز ہے اور شرک ہے۔ اب علماءِ سوء یعنی سرکاری درباری علماء جو حاسدین تھے بہت خوش ہوئے کہ اب یہ شخص صحیح گرفت میں آیا ہے' اس کی بادشاہ کے سامنے پیشی کرائی جائے۔ یہ سجدہ نہیں کرے گا تو بادشاہ کو خود بخود پتا چل جائے گا کہ اس کے دل میں باغیانہ خیالات ہیں۔ چنانچہ بادشاہ کو حضرت مجدّدؒ کے خلاف بھڑکایا گیا اور اُن کی بادشاہ کے سامنے پیشی طے ہوگئی۔ اب اہتمام یہ کیا گیا کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے انہوں نے جہاں سے آنا تھا وہاں ایک دیوار بنا کر اس میں ایک چھوٹی کھڑکی رکھی گئی کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے اس میں سے گزریں گے تب تو سر کو جھکائیں گے۔ لیکن حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے اس میں سے نکلتے ہوئے ٹانگیں پہلے نکالیں اور سر بعد میں نکالا کہ یہ شائبہ

بھی پیدا نہ ہو کہ اُن کی گردن جہانگیر کے آگے جھکی تھی۔ اس لیے کہ یہ گردن صرف اللہ کے سامنے جھکنے کے لائق ہے۔ یہ قلم تو ہو سکتی ہے لیکن اللہ کے سوا کسی کے سامنے جھک نہیں سکتی۔ لہٰذا جہاں جہاں بھی مراسمِ عبودیت اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ادا ہو رہے ہیں' چاہے قبر کو سجدہ ہو رہا ہے یا کسی اور چیز کو' وہ شرک ہے۔

نذر لغیر اللہ شرک ہے

نذر بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ چنانچہ نذر اگر ماننی ہے تو صرف اللہ کے لیے مانی جائے' کسی اور کے لیے قطعاً نہیں۔ اوّل تو اسلام کا مزاج یہ ہے کہ نذر کو پسند ہی نہیں کرتا۔ یہ تو گویا بنیا پن کی ذہنیت اور گھٹیا سا انداز ہے کہ اے اللہ! اگر میرا یہ کام ہو جائے تو میں یہ کروں گا اور یہ کام ہو جائے تو میں دو نفل پڑھوں گا۔ تم نے گویا اپنے دو نفلوں کی بڑی قیمت سمجھی ہے۔ اللہ سے یہ سودے بازی نہ کرو' بلکہ جو کر سکتے ہو کرو اور اس سے جو بھی مانگنا ہے مانگو۔ اس کے ہاں مانگنے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کسی صحابیؓ نے نذر کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلنَّذْرُ لَا یُقَدِّمُ شَیْئًا وَلَا یُؤَخِّرُہٗ ' وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبُخِیْلِ)) (۱)

''نذر کسی شے کو نہ آگے کرتی ہے نہ پیچھے کرتی ہے' اس سے تو بس بخیل سے کچھ نکلوا لیا جاتا ہے۔''

یعنی جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نذر کے ذریعے ان سے کچھ نکلوا لیتا ہے۔ لیکن بہرحال اگر نذر مانی ہو تو اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ نیک لوگوں کی صفات میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ۝۷﴾

(الدھر/الانسان)

''یہ لوگ (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں اور اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی

(۱) صحیح مسلم' کتاب النذر' باب النھی عن النذر وانہ لا یرد شیئا۔

آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی''۔

ایسا نہ ہو کہ کام ہو گیا ہے تو اب جو تھوڑا بہت مانا تھا آدمی اس کو بھی کرنے کو تیار نہ ہو۔ بہرحال نذر بھی صرف اللہ کے لیے ہے' کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ اگر کسی اور کیلئے نذر مانی گئی تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کو قادرِ مطلق سمجھا گیا ہے' حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا گیا ہے۔ نذر جس کے لیے بھی ہوگی اس کے لیے یہی تصور ذہن میں ہوگا اور یہی تو شرک ہے۔

دُعا غیر اللہ کے لیے نہیں ہے

عبادت کے اجزاء میں سے چوتھی چیز دعا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ)) (۱) ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔ اور: ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ)) (۲) ''دعا ہی عبادت ہے''۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۝۶۰﴾ (المؤمن)

''اور تمہارے ربّ نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو' میں تمہاری پکار (دعا) کو قبول کروں گا۔ یقیناً جو لوگ میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (گھمنڈ کرتے ہیں) وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ورسوا ہو کر''۔

یہ آیت بڑی اہم ہے۔ اس کے پہلے ٹکڑے میں لفظ ''دعا'' اور دوسرے ٹکڑے میں لفظ ''عبادت'' آیا ہے۔ یعنی دعا سے اِباء کرنا دراصل عبادت سے اِباء کرنا ہے۔ اگر اللہ کو پکارتے نہیں ہو تو تمہارے اندر استغناء اور تکبر ہے' تم اپنے آپ کو کچھ سمجھے ہوئے ہو۔ مقامِ بندگی یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو محتاجِ محض شمار کرے۔ اس پر قرآن مجید میں جو نقطۂ عروج ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے:

﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ۝۲۴﴾ (القصص)

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ' باب منہ۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورۃ البقرۃ۔

''اے میرے پروردگار! میں تو فقیر ہوں ہر اُس شے کا جو تو میری جھولی میں ڈال دے''۔

ایک فقیر ہوتا ہے چھنے خاں قسم کا کہ دس روپے کا نوٹ ملے تو لے لیتا ہے اور اگر ایک دو روپے کے سکّے ملیں تو پھینک دیتا ہے' جبکہ ایک فقیر وہ ہوتا ہے کہ ایک پائی بھی اسے مل جائے تو وہ اس کا بھی محتاج ہے۔ لہٰذا بندگی کا تقاضا ہے کہ اللہ کے سامنے محتاجی ہی محتاجی ہو۔ اس لیے کہ عبد تو ہے ہی محتاج اور مقامِ عبدیت تو ہے ہی مقامِ احتیاج۔ جامۂ استغناء تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ⑮﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب کے سب فقیر ہو (محتاج ہو) اللہ کی جناب میں' اور اللہ تو بے نیاز' ستودہ صفات ہے''۔ ﷺ

رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی پیاری مثال بیان فرمائی ہے کہ ''بندوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اُن سے تم سوال کرتے ہو تو انہیں ناگوار گزرتا ہے' جبکہ (اس کے برعکس) اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے سوال نہیں کرتے تو اسے ناگواری ہوتی ہے''۔ اللہ کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ میرے بندے مجھ سے مانگتے نہیں ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں!

مذکورہ بالا آیت ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ﴾ فعل امر پر مشتمل ہے کہ ''تمہارے ربّ نے کہا ہے کہ مجھے پکارو (مجھ سے دعا کرو) میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا''۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ⑥⓪﴾ (المؤمن) ''یقیناً جو لوگ میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (گھمنڈ میں مبتلا ہیں) وہ عنقریب داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل و رسوا ہو کر''۔

دعا کرنے اور پکارنے میں توحید یہ ہے کہ ایک اللہ کو پکارنا دیگر تمام پکاروں سے

مستغنی کر دے۔ اگر ایک اللہ کے پکارنے نے تمہیں مستغنی نہیں کیا اور اللہ کا پکارنا کافی نہیں ہے تو پھر اللہ کو تمہارے پکارنے کی قطعاً ضرورت نہیں' پھر انہی کو پکارو' اللہ تو بڑا غیور ہے۔ اگر اللہ کو پکارنے کے بعد بھی کسی اور کو پکارنے اور اس سے مانگنے کی کچھ بھی احتیاج اور امکان باقی ہے تو یہ ''شرک فی الدعاء'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ مبارک ہے:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ⑱﴾ (الجنّ)

''اور یہ کہ مسجدیں (یا وہ اعضاءِ انسانی جن کے اوپر سجدہ ہوتا ہے) سب اللہ کے لیے ہیں' پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو''۔

دیکھئے یہاں ''مَعَ اللّٰهِ'' کا لفظ ہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی پکارا جا رہا ہے تو یہ شرک ہے۔ اور اگر کسی کو اطاعت و محبت اور دعا کے معاملے میں اللہ سے بھی اوپر کر دیا تو یہ شرک سے بھی بڑھ کر گمراہی ہے۔ اور اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کو پکارنے کے بجائے کسی اور کو ہی پکارا جا رہا ہو تو یہ تو ﴿ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ والی بات ہے۔ **اعاذنا اللّٰه من ذٰلك!** لہٰذا اللہ تعالیٰ کے علاوہ یا اُس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارا جائے۔ یہ ہے ''توحید فی الدعاء'' ۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے اسی کا وعدہ کرتے ہیں کہ: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ عبادت کا لبِّ لباب اور جوہر چونکہ دعا ہے اور دعا ہی اصل عبادت ہے لہٰذا ہمیں یہ الفاظ سکھائے گئے ہیں: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ''(اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے'' ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ ''اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔

دُعا کے ضمن میں ایک اور باریک بحث بھی سمجھ لیجیے! استمداد' استدعا' استنصار اور استغاثہ یہ سب ایک ہی قبیل کے عربی الفاظ ہیں۔ استمداد کا مطلب ہے کسی سے مدد طلب کرنا' استدعا یہ ہے کہ کسی کے سامنے کوئی درخواست پیش کرنا' استنصار سے مراد ہے کسی سے نصرت چاہنا اور استغاثہ یہ ہے کہ کسی کی دہائی دینا۔ اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک شکل ہے بااسبابِ ظاہری کسی سے کوئی مدد طلب کرنا۔ مثلاً میں کسی سے کہتا ہوں کہ مجھے ذرا پانی لا کر پلا دیں تو میں نے ایک طرح سے اُس سے مدد طلب کی۔ ظاہری اسباب اور قوانین طبعی کے

اندر اندر کسی سے کچھ مانگنے اور مدد طلب کرنے کے بارے میں تین باتیں جان لینا ضروری ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس ضمن میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ تلقین کی ہے کہ حتی الامکان کسی سے مدد نہ مانگو' بلکہ اپنے کام خود کرو۔ نبی اکرم ﷺ کا اپنا مزاجِ گرامی تو یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوتے اور کوڑا زمین پر گر جاتا تو کسی اور سے کہنے کے بجائے اونٹنی کو بٹھاتے اور اتر کر خود ہی کوڑا اٹھا لیتے' تاکہ اسبابِ ظاہری کے اندر بھی کوئی مشابہت پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن بہرحال اسبابِ ظاہری کے تحت کسی سے کوئی تعاون طلب کرنا' کسی سے مدد چاہنا اگرچہ یہ بھی ایک طرح کی دعا اور پکار ہے مگر اس میں شرک کا پہلو نہیں ہے' بلکہ یہ اپنے اپنے مزاج سے متعلق ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات دل میں بیٹھ جائے کہ یہ شخص میرا کام کر سکتا ہے اور اس وجہ سے اُس کے سامنے گریہ و زاری بھی ہو رہی ہو اور تضرّع بھی ہو رہا ہو تو یہ ایک درجے میں شرکِ خفی بن جاتا ہے۔ اُس وقت دراصل آدمی حجاب اور مغالطے میں آ چکا ہوتا ہے اور ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کی نفی کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ کسی شخص سے کچھ مانگنا ہے تو اس عقیدے اور یقین کے ساتھ مانگو کہ وہ شخص تمہارے لیے صرف وہی کچھ کر سکے گا جو اللہ چاہے گا۔ یعنی اللہ ہی اس کے دل میں بات ڈالے گا کہ وہ تمہارے لیے وہ کام کرے۔ بہرحال اسبابِ ظاہری کے ساتھ جتنا شغل اور شغف روا ہے اس سے زائد جب ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ظاہری اسباب و وسائل پر ہی تکیہ' بھروسہ اور یقین و ایمان پیدا ہو گیا ہے۔

آپ اپنی بڑی بوڑھیوں کو دیکھتے ہوں گے کہ جب وہ بچے کو دوا پلا رہی ہوتی ہیں تو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ کہہ رہی ہوتی ہیں کہ ''اللہ شافی' اللہ کافی''۔ مریض کو دوا پلانا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ہدایت ہے' لیکن توحید یہ ہے کہ توکل اور بھروسہ دوا پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہو کہ دوا میں تاثیر تب ہو گی اگر اللہ چاہے گا' شافی اصل میں دوا نہیں ہے بلکہ اللہ ہے۔ اللہ چاہے تو بغیر دوا کے بھی شفا دے دیتا ہے۔ وہ شافی بھی ہے اور کافی بھی ہے۔ لیکن اس کے برعکس کیفیت وہ ہوتی ہے کہ گھلے جا رہے ہیں اس صدمے سے کہ ہم اپنے بچے کے لیے فلاں ڈاکٹر کا علاج نہیں کرا پا رہے' یا علاج کے لیے امریکہ یا انگلستان نہیں بھیج پا رہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اصل تکیہ اور توکّل خدا کی ذات کے بجائے دوا پر ہو گیا ہے۔ نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ امریکہ اور انگلستان میں بھی لوگ مرتے ہیں۔ سارے آپریشنز اور جدید ترین علاج کے باوجود موت کا علاج تو وہاں بھی نہیں ہے اور بہترین معالجوں کے ہاتھوں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ امریکہ میں تو اس سپیشلائزیشن کے دَور میں بھی بڑے بڑے بلنڈرز اور حماقتیں ہو رہی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ شفا اُن کے ہاتھ میں ہے۔ صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ جتنے کچھ اسباب و وسائل ہماری استطاعت میں ہیں اُن سے استفادہ کریں اور عقیدہ یہ رکھیں کہ شفا صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ' معاذ اللہ' ان وسائل کا محتاج نہیں ہے' وہ جو کرنا چاہے بغیر کسی سبب کے خود کرنے پر قادر ہے۔ اور اسباب میں بھی کوئی تاثیر نہیں ہے جب تک اللہ نہ چاہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے صد فی صد درست کہا تھا کہ: لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ ''فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں''۔ تو ظاہری اسباب میں بھی جب آدمی کسی کے سامنے گڑگڑائے' اپنے آپ کو اس کے سامنے ذلیل کرے اور اپنی عزتِ نفس کا دھیلہ کرے یہ سمجھ کر کہ بس یہی میرا کام کر سکتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں میرا خیر یا شر ہے تو وہاں شرکِ خفی کی آمیزش پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ ظاہری اسباب سے بالاتر ہو کر اللہ کے سوا کسی کو ہرگز نہیں پکارا جا سکتا' نہ کسی ولی کی روح کو' نہ کسی نبی کی روح کو اور نہ کسی فرشتے کو۔ کسی غیر اللہ کے لیے استمداد' استدعا' استنصار اور استغاثہ کُل کا کُل شرک ہے۔

اس ضمن میں ایک لطیف سی بحث اور بھی ہے جس کی میں وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ صوفیاء کے ہاں یہ رائے بڑی عام اور پھیلی ہوئی ہے کہ اولیاء اللہ کی روحیں انتقال کے بعد ملائکہ کے طبقۂ اسفل کے ساتھ شامل کر دی جاتی ہیں۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی اس عالمی حکومت کے کارندے ہیں۔ یہ اس کی سول سروس ہے کہ فلاں حکم کی تنفیذ کے لیے اسے فلاں فرشتے کے حوالے کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ حکم اللہ تعالیٰ ہی کا ہوتا ہے۔ فرشتوں کے بارے میں قرآن حکیم میں آیا ہے:

﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝۶﴾ (التحریم)

”وہ (فرشتے) اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے“۔

ملائکہ کے مختلف طبقات ہیں۔ یعنی ملأ اعلیٰ' ملائکہ مقربین' ساتوں آسمانوں کے ملائکہ اور پھر **ملائکۃ الارض۔ ملائکۃ الارض** جو ہیں وہ طبقۂ اسفل ہے' یعنی سب سے نچلا طبقہ جو یہاں اللہ کے احکام کی تنفیذ میں لگا ہوا ہے۔ تو ایک رائے یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی ارواح کو بھی اُن کے انتقال کے بعد ملائکہ کے طبقۂ اسفل میں شامل کر دیا جاتا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی سول سروس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مجھے اگرچہ کتاب وسنت سے ایسی کوئی دلیل نہیں ملی کہ میں حتمی طور پر یہ کہہ سکوں کہ یہ رائے درست ہے' لیکن یہ خارج از امکان بھی نہیں ہے اور میرے نزدیک اِس کو مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ساتھ مجھے ایک گہری محبت ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپؒ قرآن وسنت کا بہت گہرا فہم رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے اور احادیثِ مبارکہ سے دلائل بھی دیے ہیں۔ ایک دلیل آپؒ یہ لائے ہیں کہ جب غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب (جعفر طیار) رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور اُن کے دونوں بازو کٹ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((رَاَیْتُ جَعْفَرًا یَطِیْرُ فِی الْجَنَّۃِ مَعَ الْمَلَائِکَۃِ)) (۱)

”میں نے دیکھا کہ جعفرؓ ملائکہ کے ساتھ جنت میں اڑتے پھر رہے ہیں۔“

اگرچہ اس حدیث مبارکہ کی رو سے یہ معاملہ شہداء سے متعلق ہے' لیکن اگر اس دلیل کو مان بھی لیا جائے کہ ملائکہ کے طبقۂ اسفل میں اولیاء اللہ کی ارواح بھی شامل ہو جاتی ہیں اور احکامِ خداوندی کی تنفیذ میں ملائکہ کے ساتھ وہ بھی شامل ہو جاتے ہیں' پھر بھی اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ ان کو پکارا جائے۔ یہ تو خیر طبقۂ اسفل سے متعلق ہیں' ملأ اعلیٰ کو پکارنا بھی شرک ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یَا جِبْرَاءِ یْلُ اَغِثْنِیْ ”اے جبرائیل! میری مدد کو پہنچو“ تو یہ شرک ہو جائے گا۔ پکارا جائے گا صرف اللہ کو۔ وہ مدد کے لیے چاہے جبرائیل کو بھیجے' میکائیل کو بھیجے یا کسی ولی اللہ کی روح کو بھیج دے' یہ اُسی کا کام ہے۔ ہمیں

(۱) رواہ الطبرانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

اجازت نہیں ہے کسی اور کو پکارنے کی۔ ہمیں بس یہی حکم ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾﴾ (الجن) ”پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو!“ اور: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ﴾ (القصص: ۸۸) ”اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکار“۔ اگر کوئی شخص علمی اعتبار سے اولیاء اللہ کے بارے میں مذکورہ بالا رائے رکھتا ہے تو اس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے' لیکن اگر ان کو پکارا جائے گا تو یہ شرک ہو جائے گا۔ مافوق العادت یعنی قانونِ طبیعی و ظاہری سے اوپر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارا جائے تو اس کے شرک ہونے میں قطعاً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم-اخلاص

عبادت کا پانچواں اور آخری جزو ”اخلاص“ ہے جو عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم ہے۔ اس کی ضد ہے ریا اور سُمعہ' یعنی لوگوں کو دکھانے اور سنانے کیلئے کوئی نیک کام کرنا کہ لوگ میری مدح وستائش کریں۔ ان کے شرک ہونے میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے' اور ان کا شرک ہونا رسول اللہ ﷺ نے خوب واضح کیا ہے۔ ایک حدیث نبوی ﷺ ملاحظہ ہو:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (۱)

”جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا۔“

عربی زبان میں فعل ماضی پر جب ”قَدْ“ لگتا ہے تو یہ ماضی قریب یا Present Perfect Tense کا مفہوم پیدا کرتا ہے کہ فلاں کام قطعی اور یقینی طور پر ہو چکا' اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہماری ہدایت اور رہنمائی کے لیے اسے اس قدر باریک بینی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو

(۱) مسند احمد۔

اور وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، نماز ذرا رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا شروع کر دے، سجدہ ذرا طویل کر دے تو یہ ''شرکِ خفی'' ہے۔ میں مثال کے طور پر بیان کیا کرتا ہوں کہ اگر آپ نماز پڑھ رہے ہوں اور آپ کو کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو آپ معمول کے مطابق تین سیکنڈ کا سجدہ کریں، لیکن جب آپ دیکھیں کہ کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے تو اب آپ کا سجدہ پانچ سیکنڈ کا ہو جائے، تو آپ سوچیں کہ مزید دو سیکنڈ کا سجدہ کس کے حساب میں ہے؟ جان لیجیے کہ آپ کا تین سیکنڈ کا معمول کا سجدہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہے، جبکہ دو اضافی سیکنڈ کے سجدے کا مسجود اللہ نہیں ہے بلکہ وہ ہے جسے آپ دکھا رہے ہیں۔ گویا ایک سجدے کے دو مسجود ہو گئے اور یہی شرک ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ''شرکِ خفی'' کہا ہے، اعاذنا اللہ من ذٰلک۔ ''شرکِ خفی'' کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کا دیکھنا اور پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا انتہائی تاریک رات میں سیاہ پتھر پر رینگتی ہوئی ایک سیاہ چیونٹی کو دیکھنا مشکل ہے۔ اب سوچیے کہ کون بچے گا اس شرک سے؟

شرک کی معین کردہ تین اقسام سامنے آ جانے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے بارے میں یہ کہہ دے کہ میرا یہ بندہ مشرک نہیں ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۳۵﴾ (البقرۃ) ''اور وہ (یعنی میرا بندہ ابراہیم) مشرکین میں سے نہیں تھا''۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ کہا جا سکتا تھا اس ایک جملے میں کہہ دیا گیا۔ اس سے بڑی مدح وستائش اور شاباش اور کیا ہو گی اور اس سے بڑی سند، اس سے بڑا سرٹیفکیٹ اور شہادت نامہ (testimonial) اور کیا ہو گا کہ ''میرا فلاں بندہ مشرکین میں سے نہیں تھا''۔ یہی بات ہے جو بڑے پیارے انداز میں اقبال نے کہی ہے:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اپنے سینوں کے اندر جو بُت کدے آباد ہیں ان کی طرف انسان کی نظر نہیں جاتی، جبکہ باہر کے بُت کدے نظر آ جاتے ہیں۔ آپ نے گنیش جی کا بُت پوجتے ہوئے کسی کو دیکھا تو کہا یہ

شرک ہے۔ آپ نے کسی قبر کو سجدہ کرتے ہوئے کسی کو دیکھا تو کہا یہ شرک ہے۔ آپ نے کسی کو کسی غیر اللہ کو پکارتے ہوئے سنا تو کہا یہ شرک ہے۔ یہ بات درست ہے۔ اس چیز کے شرک ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ لیکن اپنی نگاہ کو ذرا اور وسیع کیجیے اور دیکھئے کہ آپ کے عقیدے اور عمل میں کہاں کہاں شرک کی آمیزش ہے۔ خاص طور پر اس دَور کے جو شرک ہیں ان کو سمجھئے! یہ مادہ پرستی کا شرک، وطن پرستی کا شرک، شخصیت پرستی کا شرک، اپنی ہوا و ہوس کو پوجنے کا شرک اور خود پرستی کا شرک کہ خود اپنے آپ کو پوج رہے ہیں ع ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں'' اپنی ہی ذات اور نفس کے گرد انسان طواف کیے چلا جا رہا ہے، یہ اصل میں اس دَور کے شرک ہیں جن کو سمجھنا ہو گا۔ بہرحال ہر خیر اور بھلائی خواہ وہ نظریے اور فکر کی ہو، عقیدے کی ہو، علم کی ہو، عمل کی ہو، اخلاق کی ہو، وہ توحید ہی کا کوئی گوشہ اور توحید ہی کی کوئی شاخ (corollary) ہے۔ ع ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!'' اس کے برعکس ہر زیغ، کجی اور گمراہی چاہے وہ نظریے اور فکر کی ہو، عقیدے کی ہو، علم کی ہو، عمل کی ہو، اخلاق کی ہو، شرک ہی کی کوئی نہ کوئی صورت ہے۔

کیا اللہ کی ہر معصیت شرک ہے؟

اب بعض حضرات کے ذہنوں میں شدت سے یہ سوال پیدا ہو رہا ہو گا کہ شرک کی جو مذکورہ بالا تشریح سامنے آئی ہے اس کی رو سے تو اللہ کی ہر معصیت شرک ہے؟ مثال کے طور پر اللہ کا حکم تھا نماز پڑھو، مگر ہم نے اللہ کا حکم چھوڑ کر نفس کا حکم مانتے ہوئے نماز ترک کر دی تو یہ شرک ہو گیا۔ ایسے ہی مال کمانے میں ہم نے شریعت کا حکم ترک کر دیا اور اللہ کی محبت سے مال کی محبت بڑھ گئی تو یہ شرک ہو گیا۔ اس طرح سے تو ہر گناہ شرک ہے۔ جبکہ قرآن مجید دو جگہ فرماتا ہے کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸ و ۱۱۶) ''یقیناً اللہ تعالیٰ اِس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، البتہ اس سے کم تر گناہ جس کو چاہے گا بخش دے گا''۔ تو اب وہ کم تر کا دائرہ جس میں مغفرت کی امید ہے، وہ کیا ہے؟ یہ سوال بہت اہم اور اس پوری بحث سے متعلق ہے۔ یہ سوال ذہنوں میں لازماً پیدا ہونا چاہیے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا

نہیں ہو رہا تو گویا اُس نے ''حقیقت واقسامِ شرک'' کی اس پوری بحث پر توجہ ہی نہیں کی۔

گناہوں کے باب میں ایک بات تو یہ جان لیجیے کہ قرآن مجید نے ایک طرف تو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی تقسیم کی ہے اور صغائر کے بارے میں بہت امید دلائی ہے کہ وہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ ان پر گرفت شدید نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ النجم میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ﴾ (آیت ۳۲) ''جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اِلاّ یہ کہ کچھ قصور (چھوٹے گناہ) اُن سے سرزد ہو جائیں''۔ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے' اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی گرفت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ' معاذ اللہ' خوردہ گیر نہیں ہے کہ ہر چھوٹی چھوٹی بات کی گرفت فرمائے۔ یہی بات سورۃ الشوریٰ میں یوں فرمائی گئی : ﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ......﴾ (آیت ۳۷) ''وہ لوگ کہ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں.....'' تو معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''صغائر'' کا معاملہ کئی اعتبارات سے ''کبائر'' سے الگ رکھا ہے۔

گناہوں کے بارے میں قرآن وحدیث سے ایک تصور یہ بھی سامنے آتا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود بھی دھلتے رہتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے : ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ﴾ (ھود:۱۱۴) ''یقیناً اچھائیاں سیّئات (چھوٹی چھوٹی برائیوں) کو ختم کر دیتی ہیں''۔ جب آپ کوئی نیکی کرتے ہیں تو صغائر دھلتے رہتے ہیں' لیکن کبائر نہیں۔ کوئی شخص نماز کی غرض سے مسجد کی طرف چلے تو ہر قدم پر اُس کے صغیرہ گناہ معاف ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایک حدیث نبوی ﷺ میں آتا ہے کہ وضو کرتے ہوئے جب کوئی شخص ہاتھوں کو دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے صغیرہ گناہ دھل جاتے ہیں۔ اسی طرح باقی اعضاءِ وضو کے متعلق فرمایا کہ ان کو دھوتے ہوئے ان سے سرزد ہونے والے گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ دین کے حقائق ہیں اور ان سے قطعاً کسی درجے میں بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

گناہ کے بارے میں قرآن مجید دوسرا فرق یہ کرتا ہے کہ ایک ہے ''کسب'' کہ جان

میں انسان سؤر بھی کھا لے تو گناہ نہیں ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۷۳) ''پس جو مجبور ہو (بشرطیکہ) سرکشی اور حد سے تجاوز نہ ہو تو (مذکورہ بالا حرام اشیاء کھا لینے میں) اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' ایسے ہی اگر جان پر بنی ہو اور سود کے علاوہ جان بچانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو یہ بھی معاف ہے۔

اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ ملاحظہ کیجیے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ......﴾ ''کیوں نہیں! جس نے ایک برائی بھی کمائی (کسب کیا)......'' خطا' نسیان اور اضطرار اس میں شامل نہیں ہے' بلکہ یہ وہ برائی ہے جو جان بوجھ کر کمائی گئی ہو اور چاہے وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ ''سَيِّئَةً'' اسم نکرہ ہے۔ نکرہ میں تفخیم بھی ہوتی ہے کہ کوئی بڑی چیز۔ یعنی اس میں ''صغائر'' شامل نہیں ہیں' بلکہ صرف ''کبائر'' ہیں۔ آگے فرمایا : ﴿وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــــَٔــتُهٗ ......﴾ ''اور اس کا گھیرا کر لیا اس کے گناہ نے......'' اس ایک گناہ پر وہ اس طرح ڈیرا جما کر بیٹھا ہوا ہے کہ گناہ نے اُس کو اپنے گھیرے میں ایسے لے لیا ہے کہ کوئی جانب ایسی نہیں جہاں گناہ کا غلبہ نہ ہو۔ ﴿فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ؀﴾ (البقرۃ) ''تو یہی لوگ جہنمی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے''۔ یعنی یہ وہ جہنمی نہیں ہیں جو آگ سے بالآخر نکل آئیں گے۔ یہ خلود فی النار کی سزا ہے جو کفار اور مشرکین کے لیے ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک بڑا گناہ بھی اگر یہ شرطیں پوری کر رہا ہو کہ وہ فیصلے اور ارادے سے کیا گیا ہو اور اُس پر دوام ہو اور اُس نے عاصی کا اس طرح احاطہ کر لیا ہو کہ کوئی جانب ایسی نہ رہی ہو جہاں گناہ کا غلبہ نہ ہو تو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ البتہ اگر کسی سے خطا ہو جائے اور اُس پر اُس کو پشیمانی ہو اور احساس ہو جائے کہ اس سے غلطی ہوئی ہے اور وہ اللہ سے بخشش طلب کرے' اس پر ڈیرا نہ جمالے اور اسے اپنی زندگی کا مستقل جزو بنانے کا ارادہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب و کتاب صاف کر دیتا ہے۔

شرکیہ اعمال کرنے والوں پر مشرک کا فتویٰ؟

اس ضمن میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ہمارے ہاں بعض لوگ ایسے ہیں کہ

بوجھ کر اور ارادے سے کوئی غلط کام کرنا' جبکہ ایک ہے ''خطا اور نسیان'' کہ ذہول ہوگیا' بھول گئے' غفلت کا پردہ پڑ گیا' لہٰذا کوئی غلطی صادر ہوگئی۔ اس میں ارادے اور کسب کو دخل نہیں۔ بالفاظِ دیگر غلط کام کرنے کی نیت نہیں تھی مگر خطا اور نسیان سے غلط کام ہوگیا۔ خطا کا مطلب ہے نشانے کا چوک جانا۔ یعنی نشانہ لگانا چاہ رہے تھے کہیں اور لیکن لگ گیا کہیں اور ۔تو نسیان اور خطا سے گناہ کا صادر ہوجانا اور شے ہے' جبکہ کسب سے گناہ کا صادر ہوجانا اور شے ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ عرش کے نیچے کے خزانوں میں سے دو اہم خزانے ہیں اور یہ تحفہ شبِ معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی وساطت سے اُمتِ مسلمہ کو عطا کیا ہے۔ ان میں سے دوسری آیت کا ایک ٹکڑا ہماری اس بحث سے متعلق ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں: ﴿رَبَّـنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اے ربّ ہمارے! اگر ہم سے بھول اور خطا (سے کوئی غلطی سرزد) ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کیجیو!'' لیکن اگر کسب ہو رہا ہو اور جان بوجھ کر کوئی گناہ کمایا جا رہا ہو اور اُس پر پھر ڈیرہ جما لیا جائے تو اس صورت میں یقیناً ایک بڑا گناہ بھی شرک کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک شخص سود کو اپنے کاروبار میں مستقلاً شامل کیے ہوئے ہے تو اس میں کسی نسیان اور خطا کا معاملہ نہیں' بلکہ اس نے ارادی طور پر اور علیٰ وجہ البصیرت ایک حرام چیز کو اختیار کر رکھا ہے اور وہ اُس کے کاروبار کا جزوِ لاینفک ہے تو یہ چیز درحقیقت شرک ہے۔ جان لیجیے کہ اگر منطقی طور پر تجزیہ کریں گے تو ہر گناہ شرک بن جائے گا' اس لیے کہ معصیت کا دانستہ ارتکاب کر کے ایک شخص نے گویا اپنی خواہشات و جذبات اور دُنیوی مفادات کو اللہ کے احکام پر فوقیت دے دی یا انہیں اللہ کی پسند و ناپسند کے برابر لے آیا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم اور مہربانی ہے کہ جب تک گناہ ذہول' خطا اور نسیان کے درجے میں ہو تو اُس کو شرک قرار نہیں دیا گیا۔ لیکن میں یہ بات بتکرار و اعادہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلط کام ''کسب'' کے درجے میں ہو اور فیصلے' شعور اور ارادے کے ساتھ کیا جا رہا ہو اور اس پر انسان مستقلاً ڈیرا جما کر بیٹھ جائے تو وہ شرک کے درجے کو پہنچ جائے گا۔ البتہ اگر اضطراری حالت درپیش ہو' انسان کی جان پر بنی ہو اور وہ بھوک سے مرا جا رہا ہو تو اس حالت

اُن کی روحِ توحیدی جب زیادہ بیدار ہوجاتی ہیں تو وہ مشرک کا فتویٰ لگانے کے لیے بڑے بیتاب ہوتے ہیں کہ فلاں بھی مشرک اور فلاں بھی مشرک۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ہر چیز کا تجزیہ کر کے بتا دیا جائے کہ یہ شرک ہے' لیکن کرنے والے کو مشرک ہرگز نہ کہا جائے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ قرآن مجید نے جہاں بُت پرستوں کو مشرک قرار دیا ہے وہاں اہل کتاب کو مشرک قرار نہیں دیا۔ ان کا شرک بیان کیا ہے' لیکن ان کی کیٹیگری جدا رکھی ہے۔ آخری وقت تک بھی یہ دو کیٹیگریز علیحدہ علیحدہ رہی ہیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ (البیّنۃ:٦) ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے وہ جہنم کی آگ کے مستحق ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔ معلوم ہوا کہ مشرکین میں سے کفار اور اہل کتاب میں سے کفار یہ دو علیحدہ کیٹیگریز ہیں۔ ایک مسلمان کفارِ اہل کتاب کی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہے' لیکن کفارِ مشرکین کی لڑکیوں سے شادی نہیں کر سکتا۔ شریعت کے اندر یہ فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تو نام ہی رکھا ہے ''مشرک''۔ جبکہ اہل کتاب اگرچہ شرک میں ملوث ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:٣١) اور: ﴿قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ﴾ (التوبۃ:٣٠) ''یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے''۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا شرک تو بیان کیا ہے لیکن ان کو مشرک قرار نہیں دیا۔ چنانچہ قرآن مجید سے اس انداز سے کسبِ ہدایت کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی مسلمان جس نے مسلمان ماں کا دودھ پیا ہے اور اس کی جو ایک ذہنی ساخت بنی ہوئی ہے اور جس مٹی سے اس کا خمیر اٹھا ہے وہ جان بوجھ کر شرک نہیں کر سکتا۔ یہ سب مغالطے اور گمراہیاں ہیں' ناسمجھی اور غلو ہے۔ تو اِن گمراہیوں کی نفی کیجیے' انہیں واضح کیجیے' ہدایت کو عام کیجیے اور اس میں مداہنت ہرگز نہ کیجیے' لیکن ایسے لوگوں پر شرک کے فتوے لگا کر اُن سے اپنے آپ کو کاٹ لینا یا اُن کو خود سے کاٹ دینا' یہ نہ تو قرآن مجید کی روح کے

مطابق ہے اور نہ ہی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کے مطابق ہے۔ شرک کو بیان کرنے میں مداہنت نہ کی جائے' لیکن جس شخص کے اعمال میں شرک کی آمیزش نظر آجائے اُس پر گرامر کا قانون لاگو کرتے ہوئے اسے مشرک نہ کہہ دیا جائے۔

اسی طرح کفر کا معاملہ ہے۔ اگر احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جس نے ایک نماز بھی ترک کی اُس نے کفر کیا۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: ((اَلصَّلَاۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ))(۱) ''نماز دین کا ستون ہے''۔ اور: ((مَنْ تَرَکَ الصَّلَاۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ جِھَارًا))(۲) ''جس نے جان بوجھ کر (بغیر کسی شرعی عذر کے) نماز کو ترک کر دیا وہ علانیہ کفر کر چکا۔'' مزید برآں صحیح مسلم کی حدیث ہے: ((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ))(۳) ''آدمی اور کفر وشرک کے درمیان نماز کا معاملہ حائل ہے''۔ تو کیا جس نے ایک نماز چھوڑی اسے کافر کہہ دیا جائے گا؟ اِن چیزوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جن لوگوں کے اندر جذبۂ توحید اور دینی حمیت بیدار ہو جاتی ہے میں ان کے لیے بھی ہمدردی کے ساتھ یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ وہ اپنے خلوص اور اخلاص ہی کی وجہ سے حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ضرورت اس بات کی ہے کہ شرک کو شرک ضرور کہا جائے' لیکن جو مسلمان ہیں اُن کے اُوپر شرک کے فتوے لگا کر اُن کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا حکمتِ دین' حکمتِ اصلاح و دعوت اور حکمتِ تبلیغ کے خلاف ہے۔

مذکورہ بالا بحث کی وضاحت کے لیے میں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ دیکھئے چوری ایک پیسہ کی بھی چوری ہے۔ مسجد سے کوئی تھوڑا سا سامان چرا لیا جائے تو وہ بھی چوری ہے' لیکن

---

(۱) شعب الایمان للحاکم ۱۰۷۷/۳۔ والمقاصد الحسنة للسخاوی : ۳۱۶۔ عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

(۲) الترغیب والترھیب للمنذری ۲۶۱/۱۔ عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ۔ **مسند احمد میں اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ ہیں:** ((فَاِنَّـهٗ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ))

(۳) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان اطلاق اسم الکفر علٰی من ترك الصلاة۔

قطعِ ید کی سزا ہر چوری پر نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کسی نے ایک روپیہ کسی کا چرا لیا تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ معاذ اللہ' اسلام میں ایسا ظلم نہیں ہے۔ ایسے ہی مشترک مال میں سے ایک فریق کچھ مال چرا لے تو اُس پر بھی قطعِ ید کی سزا لاگو نہیں ہوگی' اس لیے کہ وہ مال چرانے والا خود اس کی ملکیت میں شریک ہے۔ اسی طرح غیر محفوظ مال کی چوری پر بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ چنانچہ جس چوری پر قطعِ ید کی سزا ہے فقہاءِ کرام نے اس کی پوری وضاحت سے تعریف (definition) کی ہے۔ باقی چوریوں پر تعزیر ہے کہ قانون کے تحت کسی کو قید کی سزا دے دی جائے یا کچھ کوڑے مارے جائیں۔ تو جس طرح ایک پیسہ کی چوری بھی چوری ہے' لیکن جس چوری پر شرعی چوری کا اطلاق ہوگا اور ہاتھ کٹے گا وہ کچھ اور شے ہے۔ اسی طرح اگر تجزیہ کریں گے تو ہر گناہ شرک ہے' اس میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن شرک کا اطلاق ہر گناہ پر نہیں ہوگا۔ بلکہ اگر وہ کسب میں داخل ہے' بڑا گناہ ہے اور مستقل ہو گیا ہے تو وہ یقیناً شرک کے درجے کو پہنچ جائے گا۔ لہٰذا اس فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے! ہر گناہ کا ارتکاب کرنے والا مشرک نہیں ہو جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان کا کوئی گناہ شرک کی تمام شرائط پوری کر رہا ہے تو پھر بھی اس پر مشرک کا فتویٰ لگانے کی کیا ضرورت ہے! اللہ تبارک وتعالیٰ حساب لینے والا موجود ہے۔ بلکہ اسلامی ریاست کے اندر بھی کسی مسلمان پر مشرک کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ اس میں بھی ''مسلم'' اور ''کافر'' دو ہی کیٹیگریز ہیں' تیسری کوئی کیٹیگری معین نہیں ہے۔ یہ تقسیم تو ہو سکتی ہے کہ فلاں شخص کافر ہے اور فلاں مسلم ہے' لیکن کسی کو مشرک قرار دے دینا' اس کا فتویٰ کسی قانونِ شرعی کے اندر موجود نہیں ہے۔ ایسے ہی کسی کو منافق قرار دینا' اس کا بھی کوئی فتویٰ قانونِ شریعت میں موجود نہیں ہے۔ اس دنیا میں کسی کو ہم یہ سند بھی نہیں دے سکتے کہ وہ مؤمن ہے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں کتنا ایمان ہے۔ ہم اس کو زیرِ بحث نہیں لا سکتے' ہم تو زیرِ بحث لائیں گے اسلام اور کفر کو۔ اور تکفیر بھی جان لیجیے کہ انفرادی معاملہ (individual act) نہیں ہے کہ جو شخص چاہے کھڑا ہو کر فتویٰ دے دے کہ فلاں کافر ہے' بلکہ یہ اسلامی ریاست کا کام ہے کہ وہ تکفیر کا فیصلہ کرے۔ اس کو بھی ہمارے ہاں بازیچۂ اطفال بنا لیا گیا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کے اندر ذرا

سا بھی شرک کا شائبہ نظر آ جائے تو اس کو مشرک قرار دے دینا اور اُس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا جو مشرکین کے ساتھ ہے' یہ سراسر غلو ہے۔ اس غلو نے ایسی کھینچ تان پیدا کر دی ہے کہ اب فریقین کے مابین میل جول (communication) نہیں رہا۔ طبقات بالکل جدا ہو گئے ہیں' ایک دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں۔ دیکھئے اگر ہم نے کسی معاملے میں اپنے نفس کی خواہش کو اللہ کے حکم پر مقدم رکھا تو ہم ہرگز پسند نہیں کرتے کہ کوئی ہمیں مشرک قرار دے۔ اسی طرح ہمیں چاہیے کہ اس طرح کی نرمی اور رعایت (concession) دوسروں کو بھی دیں' بلکہ اپنے سے زیادہ دیں۔

مختصر یہ کہ شرک کی مذمت لازماً کی جائے' اس میں مداہنت ہرگز نہ ہو' لیکن کسی کو مشرک قرار دے کر اُس سے قطع تعلق کر لینا' یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی کوئی امید نہیں' بلکہ نقصان ہی کا اندیشہ ہے۔

اقول قولی هذا واستغفرالله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

۞۞۞